جلد 12 شمارہ 11 اکتوبر 2010ء ذُوالقعدۃ 1431ھ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

صداقت

اللہ

محبت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

منشور دعوت

قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

(التوبہ ۔ 51)

ترجمہ

آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہو۔ وہی ہمارا کارساز ہے۔ مومنوں کو اللہ ہی کا بھروسہ رکھنا چاہئے۔

ماہنامہ
فلاحِ آدمیت
گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیاد خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

Mob: 0300-6493335

مدیر : احمد رضا

نائب مدیر : پروفیسر محمد احمد شادؔ

تقسیم کنندہ : نعمان احمد
0300-6452570

ڈیزائننگ اینڈ کمپوزنگ : محمد رفیق

مجلس ادارت

خالد مسعود، پروفیسر منیر احمد لودھی
ائیر کموڈور (ر) اعجاز الدین
پیر خان، عتیق احمد عباسی
ایم طالب، عبدالقیوم ہاشمی
پروفیسر غلام شبیر شاہد

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ کے لئے

مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سیکنڈری بورڈ)

وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:055-3862835
055-4005431

رابطہ مدیر: 0321-6400942

فیکس نمبر: +92-55-3736841

ای میل: info@toheedia.net

قیمت شمارہ ——— 25/- روپے

سالانہ فنڈ ——— 250/- روپے

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

اس شمارے میں

درس قرآن

(ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک)

الشعراء

نام

اِس سورۃ کے آخر میں ''شعرا'' کے ذکر کی وجہ سے یہی اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق یہ سورۃ سورہ طٰہٰ کے بعد نازل ہوئی اور یہ یقینی بات ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہما اس وقت اسلام قبول کر چکے تھے۔

مضامین

اس سورۃ کا آغاز نبی اکرم ﷺ کیلئے حوصلہ افزائی اور تسلی کے الفاظ سے ہے کیونکہ کفار کے مسلسل انکار کے باعث آپ ان کو مطمئن کرنے کیلئے تگ و دو کرتے اور وہ مسلسل انکار کرتے اور کہتے کہ یہ کلام الٰہی نہیں بلکہ شعر، کہانت وغیرہ ہے اور اس تعلیم میں عظمت والی کوئی بات نہیں۔ اِسی لئے قوم کے جوان اور معاشرتی اعتبار سے کمزور افراد اس کو قبول کرتے ہیں اور اشرافِ قوم اس سے گریزاں ہیں۔ کفار کی اس بات کے جواب میں اس سورۃ کا نزول ہوا۔

اِس سورت کے ابتدا ہی میں اللہ ربُّ العزت کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی تسلی وتشفی کیلئے ارشاد ہے کہ آپ ان کیلئے اس قدر رنج وغم نہ کریں کہ آپ اپنی جان ہی کھودیں کیونکہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں کہ ان لوگوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی۔ بلکہ ان کے کفر پر اڑے رہنے کی اصل وجہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ ہاں! اس کے بعد اب ان کو ایسی نشانی دیکھنے کی آرزو ہے جو زبردستی ان کی گردنوں کو جھکا دے اور وہ نشانی یقیناً آکر رہے گی۔ البتہ اس کیلئے وقت متعین ہے۔ اِس سلسلے میں اقوامِ سابقہ کے معاملات و واقعات کو بطور شاہد پیش کیا۔

اِن واقعات کے ذیل میں دو باتوں کو بطور خاص ذہن نشین کرایا گیا۔ اوّل وہ نشانیاں جو ہر صاحب عقل کے گردوپیش میں اس کو دعوت دے رہی ہیں۔ دوسری وہ نشانیاں جو فرعون قومِ نوح

عادوثمود،قوم لوط اور اصحاب الایکہ نے دیکھیں اوراس کے نتیجے میں ان کا انجام تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

اِنہی واقعات کے ضمن میں یہ بات بھی بتائی کہ ہر دور کے کفار کی ذہنیت اور انکی حجتیں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ان سب کے بہانے اور انجام یکساں ہیں۔اِسی طرح سبھی انبیاء کی تعلیمات مومنوں کی سیرت و کردار اور ان کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک جیسا ہی رہا۔اب تمام لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی تصویر کس خاکے میں موجود ہے۔

اِن واقعات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بھی ذکر کیا گیا۔مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ زبردست، قادرِ مطلق، رحیم وکریم اور جبار وقہار ہے۔

سورۃ کے آخر میں کفار کو تنبیہہ کی گئی کہ تم لوگ نشانیاں دیکھنے پر اصرار نہ کرو اور اگر تم لوگوں کو اس پر اصرار ہے تو سابقہ تباہ شدہ اقوام کے حالات پر ایک نظر ڈالو نیز قرآنِ کریم کا بلیغ انداز اِس بات کا شاہد ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں بلکہ کاہن اور اکثر و بیشتر شعراء کا کلام ظن و تخمین اور وہم پر مبنی ہوتا ہے۔ان دونوں کلاموں کے موازنے کے بعد تمہارے دل یقیناً اس بات کی شہادت دیں گے کہ یہ کہانت یا شاعری نہیں اور اگر اس کے باوجود بھی تم اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرو گے تو پھر یقینی طور پر تم ظالم ہو اور ظلم کا انجام اس سے قبل سابقہ اقوام کے احوال میں تم مشاہدہ کر چکے ہو۔

سورۃ الشعراء میں اخلاقِ حسنہ کی تلقین کرتے ہوئے توکل، ناپ تول کو پورا رکھنا اور عقیدہ و عمل کی اصلاح کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔جبکہ گمراہی، دین کے ساتھ مذاق، انبیاء کو جھٹلانا اور زمین پر فساد کی شدید مذمت کی گئی ہے۔

اس صورت میں معجزات کے ضمن میں موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضا کا تذکرہ اور سمندر کے اندر راستے بنانے کا واقعہ ہے نیز نباتات پر غور و تدبر کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طسم (1) تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ (2) لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا

يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (3) إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (4) وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ (5) فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَo(6)

''یہ روشن کتاب کی آیات ہیں ۔(اے نبی!) شاید آپ اس غم سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اپنے آپ کو ہلاک کردیں گے ۔اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے نشانی اُتاریں، پھر ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں ۔ان کے پاس (اللہ) رحمٰن کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی مگر یہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔پس یہ تو جھٹلا چکے اب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا وہ مذاق اُڑاتے ہیں''۔

عظمتِ کتاب

کتاب اللہ کی عظمت کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو ان سب کو زبردستی ایمان قبول کرنے پر مجبور کر دیتے مگر ہمیں جبری ایمان کی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ لوگ حقیقت کو سمجھ کر اپنے اختیار سے ایمان قبول کریں ۔اگر ان نصیحت بھری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہورہا تو ہم ان کو ان جیسے منکرین اور دین کا مذاق اُڑانے والے لوگوں کا حال سناتے ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی خالقیت کے ذکر کے بعد اقوامِ ماضیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور قومِ فرعون کا ذکر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دے کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کی غرض سے بھیجا گیا ۔تائید کیلئے دو معجزات بھی عطا کئے گئے اور حالات کے پیش نظر آپ کے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنا کر معاونت کے لئے ساتھ روانہ کیا۔فرعون نے معجزات دیکھ کر مناظرہ شروع کردیا اور پوچھا۔تمہارا رب کون ہے؟

موسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ میرا رب وہ ہے جو آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود ہر

چیز کا مالک ہے۔فرعون چونکہ خودفریبی کا شکار رہو کر اپنے آپ کو رب کہلاتا تھاتو اس نے اس بات کو آپ کے جنون کا سبب بتایا اور معجزات سے متاثرہ لوگوں کو برگشتہ کرنے کیلئے جادوگروں کے ساتھ مقابلے کیلئے کہا۔وقت مقررہ پر جادوگر آئے اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان قبول کرلیا۔

اس مقام پر ایک حقیقت جان لیجئے کہ ان جادوگروں کے پاس ایک فن تھا جس کو ہر شریعت نے گمراہی کہا مگر جب جادوگروں نے اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے کمال کا مشاہدہ کیا تو بے ساختہ ایمان قبول کرلیا۔فرعون نے ان کو دھمکایا مگر ان لوگوں کو عین الیقین حاصل ہو چکا تھا۔انہوں نے فرعون کی ان دھمکیوں کا نوٹس نہ لیا اور ایمان پر ثابت قدم رہے۔فرعون زچ ہو گیا۔اِدھر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم ملا کہ قوم سمیت راتوں رات یہ علاقہ چھوڑ جائیں۔موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے اپنے اسباب جمع کئے اور رات کو پہلے پہر رخت سفر باندھ کر نکل کھڑے ہوئے۔صبح جب فرعون کو خبر ہوئی تو پیچھا کرنے نکلا۔ایک پانی کی گزرگاہ پر ان کو جالیا۔موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر لاٹھی ماری۔راستہ بنا اور آپ پار جا اُترے۔فرعون نے جب تعاقب کیا تو عین بیچ دریا پانی میں غوطے کھانے لگا اور اپنی قوم سمیت غرقاب ہوا اور اللہ رب العزت نے اس کی لاش کو بطورِ عبرت قیامت تک محفوظ کر دیا۔

اِس سارے قصے کے بعد فرمایا:۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ (67)

''بے شک اِس واقعے میں نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں''۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ

اس کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا جس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اِن کے دور میں بت پرستی کرتے تھے۔آپ نے ان سے کہا کہ جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے کبھی دیکھو تو سہی،ان کی حیثیت کیا ہے؟ میں تو صرف ایک رب العالمین کا ہو کر رہ گیا ہوں اور ان بتوں کو میں اپنا دشمن شمار کرتا ہوں۔آپ نے اللہ تعالیٰ کی

صفات بیان کیں کہ اس نے مجھے پیدا کیا ہے اور مجھے ہدایت دی ہے۔

ہدایت کے معنی

ہدایت کے کئی معنی ہیں۔

اللہ ربُ العزت انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی ہدایت عطا کرتا ہے۔جانور کا بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد ماں کے پستانوں سے چپک کر دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔اگر دودھ پینے کا یہ فن اللہ تعالیٰ نہ سکھائے اور ہم سکھانے لگیں تو کیا ہوگا! دنیا کے سارے اُستاد، پروفیسر اور ماہرین نفسیات مل کر یہ چاہیں کہ کسی بچے کو دودھ چوسنے کا فن سکھا دیں تو کیا یہ ان کے بس میں ہے؟ ہرگز نہیں۔یہ وہ ہدایت ہے جو الہامی طور پر اللہ تعالیٰ ہر جاندار کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ (78) وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ (79) وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ (80)

''اُس نے پیدا کیا ہے اور رہنمائی کرتا ہے۔وہی کھلاتا ہے، وہی پلاتا ہے اور جب میں (اپنی کسی بے احتیاطی کی وجہ سے) بیمار پڑ جاتا ہوں تو شفا بھی دیتا ہے''۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بیمار کرتا ہے بلکہ بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا۔ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ ادب دیکھیں کہ انہوں نے تمام باتیں اللہ کی طرف منسوب کیں مگر جہاں بیماری کا معاملہ آیا تو کہا جب میں (اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے) بیمار پڑ جاتا ہوں تو شفا وہی دیتا ہے۔یہ ہے وہ ادب جو ہمیں نبی سکھاتا ہے۔

عاجزی و بے نفسی کی انتہا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی۔کہ ''اے اللہ! مجھے نیک لوگوں میں شامل کرنا،، اس دُعا میں کتنی تواضع و عاجزی ہے۔ابراہیم علیہ السلام سے بڑھ کر نیک کون ہوگا؟ جبکہ نبی ﷺ نے یوں دُعا کی تلقین فرمائی کہ اے اللہ! محمد پر یوں درود بھیج جیسے ابراہیم علیہ السلام پر بھیجا اور میری آل پر یوں درود بھیج جیسے آلِ ابراہیم پر درود بھیجا۔کہاں یہ مقام اور کہاں یہ عاجزی کہ ''**الحقنی بالصالحین** ''مجھے نیک لوگوں میں شامل کر دے۔یہ تواضع اور عاجزی

ضرور سیکھنی چاہئے۔

حضرت بوعلی قلندرؒ اپنے دیوان میں لکھتے ہیں:۔

بجز عجز و نیاز آں جا نمی پر سند چیزے را

بفیض خاکساری ہا تواں حل کرد مشکل ہا

اللہ تعالیٰ کے دربار میں سوائے عجز و نیاز کے کسی اور چیز کی کوئی قدر نہیں۔اور ہم نے جتنی خاکساری اختیار کی، اتنی ہی مشکلات اس نے آسان کر دیں۔

یہ ابراہیم علیہ السلام کی خاکساری ہے کہ وہ اُولُو العزم رسول ہوتے ہوئے بھی یہ دُعا کرتے ہیں"**الحقنی بالصالحین** "مجھے نیک لوگوں میں شامل کر دے۔

یہ دُعا حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی کی تھی۔

فاطر السموت والارض انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصلحینo (یوسف:101)

"آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے۔مجھے اس حالت میں موت دے کہ میں فرمانبردار رہوں اور مجھے نیکوکاروں کے ساتھ شامل کر دے"۔

یہ بھی تواضع ہے حالانکہ دُنیا کے سارے صالحین کو یہ دُعا کرنی چاہئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ساتھ نصیب فرما۔تمام انبیاء یہ دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں ابراہیم علیہ السلام کا ساتھ عطا فرما اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام یہ دُعا کرتے ہیں کہ مجھے نیک لوگوں میں شامل فرما!

جنت و دوزخ کی منظر کشی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے بعد جنت دوزخ کی منظر کشی ان الفاظ میں ہے:۔

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ (90) وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ (91) وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ (92) مِن دُونِ اللَّهِ هَلْ يَنصُرُونَكُمْ أَوْ يَنتَصِرُونَ (93) فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ (94) وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ (95) قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ (96) تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي

ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (97) إِذْ نُسَوِّيْكُم بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ (98) وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ (99) فَمَا لَنَا مِن شَافِعِيْنَ (100) وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ (101) فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (102)

''اس روز جنت پرہیزگاروں کے قریب کی جائے گی۔اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی اور ان سے کہا جائے گا کہ جن کو تم پوجتے تھے، وہ کہاں ہیں؟ یعنی اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے تھے، کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں یا خود بدلہ لے سکتے ہیں؟ تو گمراہ لوگ اوندھے منہ میں ڈال دیئے جائیں گے اور شیطان کے سب لشکر بھی۔ وہاں یہ آپس میں لڑیں گے اور کہیں گے کہ ''اللہ کی قسم! ہم تو کھلی گمراہی میں تھے۔کہ تمہیں ربُّ العالمین کے برابر شریک ٹھہراتے رہے۔ہم کو ان گنہگاروں ہی نے گمراہ کیا۔تو آج نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے نہ ہمدرد دوست۔اے کاش! ہمیں دوبارہ دنیا میں جانا ہوتا تو ہم یقیناً اہل ایمان میں سے ہوتے''

اللہ تعالیٰ کے برابر کسی سے محبت کرنا

قرآنِ کریم میں جنت اور دوزخ کے نظارے ایسے ہیں کہ انسان کا دل دہل جاتا ہے۔مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم قرآن سمجھ کر نہیں پڑھتے۔اللہ تعالیٰ وہاں بار بار پوچھے گا کہ بلاؤ اِن ساتھیوں کو جن کو تم دنیا میں پکارا کرتے تھے۔ان کا بھی حال دیکھیں کہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں یا نہیں! اُن کو پکارا جائے گا، وہ آئیں گے اور پھر آپس میں ان کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔یہ دوزخ میں اپنے معبودوں سے جھگڑا کریں گے۔معبود جنہوں نے اپنی عبادت کرائی ہوگی، وہ بھی بھی دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔اس وقت لوگ اپنے معبودوں سے کہیں گے کہ اللہ کی قسم! ہم تو صریح گمراہی میں تھے جب ہم تمہیں ربُّ العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔

سوچنے کی بات ہے کہ کوئی شخص کسی کو خواہ وہ بت ہو یا کوئی جن وانس، اسے اللہ کی برابری کا درجہ تو نہیں دیتا! بات یہ ہے کہ کسی کی محبت میں اس طرح گرفتار نہ ہو جانا کہ محبت کے برابر ہو جائے یا اللہ کی محبت پیچھے رہ جائے، یہ اس کو اللہ کے برابر قرار دینا ہے۔یہاں یہی بات کہی جارہی ہے کہ ہم تمہاری محبت میں اتنے گرفتار ہوئے کہ ہم نے تمہیں اللہ کا درجہ دے دیا! اور ربُّ العالمین کی

برابری کا مرتبہ دے دیا۔ ہم بہت گمراہ لوگ تھے۔ آج کوئی بھی ہماری مدد کرنے والا نہیں ہے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کا ذکر

اِس کے بعد سیدنا نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کا ذکر ہے۔ جب نُوح علیہ السلام نے قوم کو راہِ ہدایت کی دعوت دی تو اُنہوں نے کہا:

''کیا ہم تم پر ایمان لائیں جبکہ تمہارے پیروکار تو رذیل لوگ ہوتے ہیں'' (الشعراء:112)

کفار کا ایک وہم

یہ واہمہ بھی ہر دور کے کفار کو رہا کہ وہ اہل ایمان کو رذیل سمجھتے رہے۔ کیونکہ ان کے ہاں اصل وقار دولت، جاگیر اور عزت وشہرت کے باعث ہوتا ہے اور اسی نخوت وغرور کے باعث وہ اہل ایمان کا مذاق اُڑاتے اور ان کو دھمکیاں دیتے تھے۔ نوح علیہ السلام کو بھی قوم کے وڈیروں نے ایک دھمکی دی۔

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (116)

''اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو سنگسار کر دیا جائے گا''

اس کے جواب میں نوح علیہ السلام نے اللہ کے حضور یہ دُعا کی۔

فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحاً وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (118)

''(اے اللہ) میرے اور ان کے درمیان ایک کھلا فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں، ان کو بچا لے''

اِس کے بعد ایک عذاب آیا اور اہل ایمان کے علاوہ ساری قوم غرق ہو گئی۔ حتیٰ کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی، جس کا ذکر اس سے قبل سورہ ہود میں ہو چکا ہے۔

قوم عاد

قوم عاد کا تذکرہ شروع کیا گیا۔ سیدنا ہود علیہ السلام نے قوم کو سمجھانے کیلئے ہر طریق اختیار کیا۔ قوم کی اپنی ٹیکنالوجی، قوت وطاقت، مال واولاد اور جاگیر وزراعت غرض ہر بڑائی کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان سب کے چھن جانے کے باوجود آخرت میں بھی عذاب ہوگا۔ اس پر قوم کے

سرکش سردار کہنے لگے۔

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُن مِّنَ الْوَاعِظِيْنَ (136) إِنْ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِيْنَ (137) وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (138)

''ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں، ہمارے لئے برابر ہے۔ یہ تو پہلے لوگوں کی باتیں اور راستے ہیں۔ ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا''۔

قوم عاد کو بھی اللہ تعالیٰ نے نیست ونابود کر دیا اور فرمایا کہ اس واقعے کے اندر بھی اہل بصیرت کیلئے ایک نشانی موجود ہے۔

قومِ ثمود کی ہٹ دھرمی

اس کے بعد قومِ ثمود کی ہٹ دھرمی کو عبرت کیلئے بیان فرمایا جن کو سیدنا صالح علیہ السلام نے یوں دعوت حق دی۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِيْنَ (146) فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (147) وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ (148) وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً فَارِهِيْنَ (149) فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيْعُونِ (150) وَلَا تُطِيْعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (151) الَّذِيْنَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (152)

''یہ جو چیزیں موجود ہیں، تم ان ہی میں بے خوف چھوڑ دیئے جاؤ گے یعنی باغ، چشمے، کھیتیاں اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہوتے ہیں اور تکلیف سے پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے مکان۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو۔ اور حد سے تجاوز کرنے والوں کی بات نہ مانو جو ملک میں فساد کرتے ہیں اصلاح نہیں کرتے''

ان حقیقت افروز باتوں کو سن کر ماننے کی بجائے قومِ ثمود کے لوگ کہنے لگے:۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (153) مَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ (154)

''تم تو جادو زدہ ہو۔ تم اور کچھ نہیں بس ہماری طرح کے آدمی ہو۔ اگر سچے ہو تو کوئی نشانی

پیش کرو"۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے مطالبے کے مطابق معینہ پہاڑی چٹان میں سے ایک اونٹنی کو ظاہر کیا اور اس کی بابت ان پر کچھ پابندیاں عائد کردیں۔ جس کی خلاف ورزی پر ان کو سخت عذاب کی لپیٹ میں لیا گیا اور ان کا نشان تک اس دنیا میں نہ چھوڑا گیا۔

قومِ لوط

اسی طرح قومِ لوط کی ہدایت وراہنمائی کیلئے لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اس قوم میں شرک کے ساتھ ہم جنسی کا بھی مرض تھا۔ لوط علیہ السلام نے اُن کو سمجھایا مگر وہ ہرگز نہ مانے اور پھر ان کو ایسا عذاب دیا گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَراً فَسَاء مَطَرُ الْمُنذَرِينَ (173)

''ان پر ہم نے بارش برسائی۔ پس جو بارش ان لوگوں پر برسی، وہ ڈرائے گئے لوگوں پر بدترین بارش تھی''۔

احادیث میں ہے کہ ساری بستی کو فرشتوں نے فضا میں معلّق کر کے زمین پر اُلٹا دیا اور پھر ان پر پتھر برسائے گئے۔ جس کے باعث ان کے سارے آثار ختم ہو کر رہ گئے۔ اور یہ ان کی اس اخلاقی برائی کے باعث تھا۔

قومِ شعیب کا ذکر

اسی قسم کی ایک اخلاقی اور معاشرتی بُرائی سیدنا شعیب علیہ السلام کی اُمت بھی تھی کہ وہ کم تولتے اور کم ماپ کردیتے تھے۔ شعیب علیہ السلام نے قوم کو بہت سمجھایا مگر قوم نے وہی جواب دیا جو عام گمراہ قومیں دیتی ہیں کہ آپ پر سحر کے آثار ہیں، آپ تو انسان ہیں، نبی کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کر گزرو۔

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفاً مِّنَ السَّمَاء إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (187)

''ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا کر دکھاؤ، اگر تم سچے ہو''۔

اس قوم پر عذاب آسمان ہی سے اُترا کہ ایک بادل کا ٹکڑا آیا اور اس میں سے آگ برسا کر ان کو نابود کر دیا گیا۔

شیطانی الہام کی حقیقت

ان سب گمراہ قوموں کے تذکرے کے بعد سبق حاصل کرنے کی دعوت ہے کہ راہِ راست پر آ جاؤ ورنہ تمہارا حشر ان سے مختلف نہ ہوگا۔ پھر اہل مکہ کے ایک پروپیگنڈے کو گمراہ کن قرار دیا کہ اہل مکہ کہتے کہ نعوذ باللہ! اس (محمد ﷺ) پر شیطان اُترتا ہے اور وہ جو خیالات اس کو دیتا ہے، یہ ہمیں سنا دیتا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَى مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنُ (221) تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ (222) يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ (223) وَالشُّعَرَاء يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ (224) أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيْمُونَ (225) وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ (226) إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيْراً وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ (227)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترتے ہیں؟ ہر جھوٹے گنہگار پر اُترتے ہیں، جو سنی ہوئی بات اس کے کان میں لا ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اپنے پر ظلم ہونے کے بعد انتقام لیتے ہیں اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کونسی جگہ لوٹ کر جاتے ہیں''۔

نفس انسانی کی تین حالتیں

اِن آیات میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ شیطان کس پر اُترا کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان کو چار قسم کی طاقتوں سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ دو اِس کے اندر ہیں اور دو باہر۔ اندر کی دو طاقتیں نفس امارہ اور نفس لوامہ ہیں۔ وہ نفس جو انسان کو گناہ پر اُبھارتا ہے۔ زیادہ کھانے پینے،

زیادہ عیش پرستی، زیادہ لذت پرستی، نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا حق بھی کھانے پر ابھارتا ہے۔ یہ نفس امارہ ہے۔ جو انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔

اندر کی ایک اور طاقت ہے جس کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ یہ اللہ کو بہت پیارا لگتا ہے۔ اللہ نے ایک جگہ اس کی قسم کھائی ہے۔ "**لا اُقسم بالنفس اللوامه**"۔ اور میں "نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں" اس کو اُردو زبان میں "ضمیر" بھی کہتے ہیں۔ یہی رُوح بھی کہلاتا ہے۔ یہ آپ کے اندر ہی اندر ایک قاضی، کوتوال، سپاہی اور آڈیٹر (Auditor) بیٹھا ہے جو انسان کو بری باتوں پر ٹوکتا اور نیکی پر اُبھارتا اور شاباش دیتا ہے۔ یہ دو طاقتیں انسان کے اندر ہیں۔ ان کی جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوتی۔

روح ہے اک نغمہ ساز الست
جسم خاکی پردہ آواز ہے

اس کے علاوہ انسان کے باہر دو طاقتیں ہیں، جیسے اندر نفس امارہ ہے اسی طرح باہر شیاطین ہیں، ابلیس کی ذُریت اور اس کی اولاد ہے۔ انکا ایک پورا جال اور نظام ہے جو انسان کو نفس امارہ کی مدد سے جکڑتا ہے۔ باہر کی دوسری قوت انبیاء، علماء، اولیاء اللہ اور فرشتوں کی ہے۔ جو انسان کو نیکی پر اُبھارتے ہیں۔ ان کا تعلق نفس لوامہ یعنی ضمیر اور روح سے ہے۔ اس طرح دو طاقتیں اندر لڑ رہی ہیں اور دو طاقتیں باہر جنگ کر رہی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم کبھی ادھر جاتے ہیں کبھی اُدھر۔ اندر ہی اندر کبھی غزوہ بدر ہوتا ہے اور کبھی سقوطِ بغداد۔ کبھی سقوطِ غرناطہ اور کبھی سقوطِ ڈھاکہ ہوتا ہے۔

بس اسی کی ہے زندگی جس نے
آپ اپنے پہ فتح پائی ہے

اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پناہ مانگو اِن شیاطین سے جو جنوں کی اور انسانوں کی شکل میں بھی آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنے نفس کے شر سے پناہ مانگو۔ اور جو شخص ان دونوں سے پناہ نہیں مانگتا ہے، وہ اپنے آپ کو نفس امارہ اور شیاطین کے سپرد کر دیتا ہے۔ اندر نفس امارہ اور باہر شیاطین اور اسی میں وہ خود بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا شیطانی قوتیں بھرپور ساتھ دیتی ہیں۔ اگر وہ پڑھا لکھا آدمی ہے تو ایک خاص قسم کا شر پرست عبقری (EvilGerious)

بن جاتا ہے۔شیطانی قوتیں اس کو اتنا او نچالے جاتی ہیں کہ وہ نبوت کا دعویٰ بھی کر دیتا ہے۔اس طرح بعض اور لوگ ۔۔۔بڑے بڑے کرتب دکھا دیتے ہیں۔آپ کے ''دل کی بات'' بتا دیتے ہیں۔جوگی بن جاتے ہیں ۔ان پر ''القائے شیطانی'' ہوتا ہے۔

جس پہ بہت ناز ہے آہ تجھے بو الہوس
ننگ ہے وہ زندگی اہل نظر کے لئے

ان پر شیاطین نازل ہو کر ان کو ادھر اُدھر کی باتیں بتاتے ہیں جن میں سے اکثر جھوٹی ہوتی ہیں اور اسی سبب وہ ذلیل وخوار رہتے ہیں اور پھر انکے بارے میں قرآن پاک کہتا ہے:۔

''شیاطین ہر جھوٹے گنہگار پر اُترتے ہیں''۔ (الشعراء:222)

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہے عورت سوار

شعراء کی حقیقت

اکثر شعراء پر شیاطین نازل ہوتے ہیں۔اور ان کو اِدھر اُدھر کی باتیں سناتے ہیں جو اکثر جھوٹی ہوتی ہیں۔ان کا اتباع کرنے والے بھی بہکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ان کو شراب کباب کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔اس کے بغیر ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو شیطان سہارا نہیں دیتا۔ اگر وہ شراب نہیں پئیں تو پھر اچھے شاعر برآمد نہیں ہوتے ۔ان کے بارے میں فرمایا کہ ہر میدان میں یہ علم کے دعویدار ہوتے ہیں۔ہر میدان میں گفتگو کرتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ ان کے قول اور عمل میں تضاد ہوتا ہے۔ہاں !وہ شاعر جن میں چار صفات ہوں وہ مستثنیٰ ہیں۔

نمبر1۔ **الذین امنو۔** وہ جو ایمان لائے۔
نمبر2۔ **وعملوا الصالحات۔** اور نیک اعمال کرنے والے لوگ۔
نمبر3۔ **وذکرو اللہ کثیرا۔** ہر دم اللہ کو یاد کرنے والے لوگ۔
نمبر4۔ کسی پر زیادتی کرنے والے نہیں۔

اگر ایسے شاعر ہوں تو ان پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔پھر شیاطین ان پر نازل نہیں ہوتے بلکہ الہام ربانی ہوتا ہے۔

(درس حدیث)

زندگی کی تفریحات

محمد جعفر پھلواروی

سنن ترمذی میں اُم المومنین سیدہ عائشہؓ سے ایک روایت یوں ہے۔

کان رسول اللہ ﷺ جالسا فسمعنا لغطا وصوت صبیان فقام رسول اللہ ﷺ فاذا حبشیة تزفن والصبیان حولھا فقال یا عائشة تعالیٰ فانظری فجئت فوضعت لحیی علی منکب رسول اللہ ﷺ فجعلت انظر الیھا فقال اما شبعت؟ اما شبعت؟ فجعلت اقول لا ، لانظر منزلتی عندہ اذا طلع عمر فارفض الناس عنھا فقال رسول اللہ ﷺ انی لا نظر شیاطین الانس والجن فدمروا من عمر۔ قالت فرجعت۔

حضورﷺ ایک بار بیٹھے تھے کہ کچھ شور اور بچوں کی آواز آنے لگی۔حضورﷺ اُٹھ کھڑے ہوئے۔دیکھتے کیا ہیں کہ ایک حبشی عورت دف بجا بجا کر رقص کر رہی ہے اور بچے اسے گھیرے ہوئے ہیں۔حضورﷺ نے فرمایا کہ عائشہؓ ادھر آ کر نظارہ کرو۔میں آئی اور حضورﷺ کے کاندھے پر اپنا چہرہ رکھ کر نظارہ کرنے لگی۔حضورﷺ نے کئی بار فرمایا کیا ابھی سیری نہیں ہوئی؟ اور ہر بار میں نے نفی میں جواب دیا۔دراصل میں دیکھنا چاہتی تھی کہ حضورﷺ کے دل میں میری کتنی جگہ ہے (یعنی میری کتنی دل جوئی فرماتے ہیں)۔اتنے میں حضرت عمرؓ برآمد ہوئے (جنھیں دیکھتے ہی) سارا مجمع اس حبشن کے پاس سے بھاگ کھڑا ہوا۔حضورﷺ نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ انس و جن کے شیاطین عمرؓ کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس کے بعد میں بھی واپس آ گئی۔

صاحب التاج الجامع للاصول نے بھی اس حدیث کو بحوالہ ترمذی ہی نقل کیا ہے اور اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ۔۔۔

تزفن ای ترقص و تضرب بالدف ٥

یعنی اس حدیث میں جو 'تزفن' کا لفظ آیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حبشیہ رقص کر رہی تھی اور دف بجاتی جا رہی تھی۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

و فی ھذین عظیم لطف النبی ﷺ بالعباد وجواز سماع اللھو بقدر الحاجۃ ٥

اِن دونوں روایتوں سے (جن میں ایک اس روایت سے پہلے نقل کی گئی ہے) پتہ چلتا ہے کہ حضور بندوں پر کس قدر مہربان تھے۔ نیز ان دونوں روایتوں سے بقدرِ ضرورت 'لہو' کے سننے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔

بات پوری نہ ہوگی اس سے پہلے کی روایت بھی نقل نہ کر دی جائے۔ یہ بھی حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے اور اُسے بخاری، مسلم اور نسائی تینوں نے روایت کیا ہے۔ وہ یوں ہے:

دخل رسول اللّٰہ ﷺ وعندی جاریتان تغنیان بغناء بعاث فاصطجع علی الفراش وحول وجھہ و دخل ابوبکر فانتھرنی وقال مذمارۃ الشیطان عند النبی ﷺ؟ فاقبل علیہ ﷺ فقال دعھما فلما غفل غمزتھما فخرجتا۔

حضور ﷺ ایک بار میرے پاس تشریف لائے تو اس وقت میرے پاس دو لڑکیاں جنگ بعاث کے گانے گا رہی تھیں۔ حضور ﷺ بستر پر لیٹ گئے اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور مجھے ڈانٹ کر کہا کہ رسول اللہ کی موجودگی میں اور یہ شیطانی گیت؟ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ رہنے بھی دو اِن بے چاریوں کو۔ اس پر جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے ان دونوں عورتوں کو اشارہ کیا اور وہ چلی گئیں۔

اس کے بعد ذکر ہے کہ:

اس دن عید تھی۔ حبشی مسجد نبوی میں اپنے ڈھالوں اور نیزوں کے کرتب دکھا رہے تھے۔

حضورﷺ کے دوش مبارک پر حضرت عائشہؓ نے اسی طرح اپنی ٹھوڑی رکھ کر ان کا کھیل دیکھا۔ حضورﷺ ان کے کرتب کی حوصلہ افزائی فرماتے اور شاباش دیتے جاتے۔حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو واپس آ گئیں۔

ان دونوں روایتوں میں دو الگ الگ واقعات کا ذکر ہے اور دونوں میں گانے بجانے کے متعلق شیطانی فعل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔پہلی روایت میں تو یہ ہے کہ جب لوگ حضرت عمرؓ کو دیکھ کر بھاگے تو حضورﷺ نے فرمایا کہ:انسی وجنی شیاطین عمر سے بھاگ کھڑے ہوئے (یا بھاگ کھڑے ہوتے ہیں) دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اِسے شیطانی گیت قرار دیا۔اب یہاں سخت پیچیدگی یہ پیدا ہوتی ہے کہ کیا نعوذ باللہ حضورﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ شیطانی فعل دیکھتے رہے اور شیطانی گیت سنتے رہے؟ بلکہ اُلٹا حضرت ابوبکرؓ کو روک کر اس شیطانی حرکت پر رضامندی کا اظہار فرمایا؟

ایسا گمان کرنا بلکہ وہم میں لانا بھی بدترین کفر ہے۔پھر سوال یہ ہے کہ اس ''شیطانی حرکت'' کی کیا توجیہہ ہوگی؟

اصل بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی ہیبت سے یا حضرت ابوبکرؓ کی خفگی سے کوئی حلال شے حرام نہیں ہوسکتی۔حرام صرف وہی شے ہے جسے رسولﷺ باذنِ الٰہی بتا دے۔اور حضورﷺ کے متعلق یہ وہم لانا بھی کفر ہے کہ کسی چیز کو حرام جانتے ہوئے بھی عمل اس کے خلاف کریں۔دراصل بات یہ ہے کہ بہت سی باجبروت شخصیتیں ہر دور اور ہر بستی میں ایسی ہوتی ہیں جن سے عوام ڈرتے ہیں، بچے خوف کھاتے ہیں اور ڈر سے بہت سے جائز کام بھی چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ندوۃ العلما کے بورڈنگ کے نگرانِ کل مولانا شبلی فقیہہ جیراجپوری تھے۔ بڑے چھوٹے سب طلبہ ان سے اس قدر ڈرتے تھے کہ جہاں ان کی آہٹ یا آواز سنی اور ادھر اُدھر بھاگنے چھپنے لگے۔طلبہ اگر کچھ کھیل رہے ہوں جب، آپس میں باتیں کر رہے ہوں جب، بیت بازی ہو رہی ہو جب، غرض جس حال میں ہوتے مولانا شبلی کی آہٹ سنتے ہی چھپنے لگتے تھے۔اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ بچوں کا ان کی آواز سن کر بھاگنا اس بات کی دلیل ہے کہ

مولانا شبلی کی نگاہ میں طلبہ کا گپ کرنا یا کھیلنا یا بیت بازی کرنا کوئی گناہ تھا۔

حضرت عمرؓ کی ہیبت وجلالت کا بھی یہی حال تھا۔ عام لوگوں نے جہاں ان کی آہٹ سنی اور دبکنا شروع ہو گئے۔ گانا بجانا چھوڑ کر لوگوں کے بھاگنے سے یا حضور ﷺ کے یہ فرمانے سے کہ عمر سے شیطان بھاگتا ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ گانا بجانا ناجائز تھا۔ شیطان بہت سے معنوں میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

عطاء بن یسار سے موطا امام مالک میں ایک حدیث یوں ہے:۔

کان النبی ﷺ فی المسجد فدخل رجل ثائر الرائس واللحیة فاشاد الیه ﷺ بیده کانه یامره باصلاح شعره ولحیة ففعل ثم رجع فقال ﷺ الیس هذا خیرا من ان یاتی احدکم ثائر الراس کانه شیطانo

حضور ﷺ مسجد میں جلوہ افروز تھے کہ ایک شخص آیا جس کے بال پریشان اور داڑھی اُلجھی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے اسے اشارے سے حکم دیا کہ اپنے بال اور داڑھی ٹھیک کرو۔ اس نے تعمیل حکم کی اور واپس چلا گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ بہتر ہے یا بکھرے ہوئے بال لے کر آنا جیسے شیطان چلا آ رہا ہو۔

اس حدیث کو غور سے پڑھ کر بتایئے کہ بکھرے ہوئے بالوں اور اُلجھی ہوئی داڑھی کا ہونا ایسا ہی شیطانی فعل ہے کہ اِسے چوری یا بدکاری کی طرح حرام سمجھ لیا جائے؟ اگر خدانخواستہ آپ کا یہی خیال ہے تو آج کل ستر فیصد داڑھی اور بال رکھنے والے جن میں زیادہ تر علمائے کرام ہی ہیں اِسی لقب کے مستحق ٹھہریں گے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ بعض ناگوار چیزوں کو بھی شیطان یا شیطنت کہہ دیا جاتا ہے اور ان کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی تیز یا ذہین یا شریر بچوں کو شیطان کہہ دیتے ہیں یا پھر تیلے آدمی کو جن کہہ دیتے ہیں لیکن اس سے کوئی بھی ''شیطان رجیم'' مراد نہیں لیتا۔ علاوہ ازیں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو لطیف ہونے کے باوجود کسی کے ذوق کے مطابق نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہی چیزیں ایک کیلئے باعث دردِسر

ہوں گی اور دوسرے کیلئے باعث تفریح۔ایک کی نگاہ میں سنجیدگی اور بزرگانہ ادب کے خلاف ہوں گی اور دوسرے کی نظر میں نہ ہوں گی۔ ہماری تہذیب میں بڑوں کے سامنے برہنہ سر بیٹھنا خلاف ادب سمجھا جاتا ہے۔اگر کوئی متین شخص کسی کو اس برہنہ سری سے ڈانٹ دے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ برہنہ سر ہونا ''حرام'' ہے۔اگر جناب ابو بکرؓ نے گانے بجانے پر حضرت عائشہؓ کو ڈانٹ دیا تو عین ادب رسولؐ کا تقاضا تھا۔اِسے حرام و ناجائز ہونے سے ذرا بھی تعلق نہیں۔ورنہ ایک معمولی عقل والا انسان بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ ایک ناجائز چیز پر حضورؐ خود کیوں خاموش رہتے بلکہ یوں کہیے کہ خود حضرت ابو بکرؓ کو برہم ہونے سے کیوں روک دیتے؟

اِن احادیث میں صرف اتنی ہی بات نہیں کہ ایسی تفریحات کو حضور ﷺ نے اپنے عمل سے جائز قرار دیا بلکہ ان میں ایک بہت بڑی حقیقت یہ بھی پنہاں ہے کہ مطائب و تفریحات بھی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے۔ ہر وقت ایک سنجیدہ سجادہ نشین یا متقشف مولوی کے موڈ میں رہنا کوئی اسلامی تقاضا نہیں۔یہ زی خشکی (یا ''وہابیت'') ہے۔حضور ﷺ جس اعلیٰ ترین مقصد کیلئے بھیجے گئے تھے اس میں حضورؐ کو اتنا انہماک تھا کہ ان تفریحات کے لئے حضورؐ کے پاس وقت ہی نہ تھا (اور تقریباً یہی حال خلفائے راشدینؓ کا بھی تھا)۔لیکن اس کے باوجود چونکہ حضورؐ زندگی میں توازن (نہ کہ تقشف) پیدا فرمانا چاہتے تھے اور اسی دنیا کو جنتی زندگی کا نمونہ بنانا چاہتے تھے اس لئے تفریح کے مواقع پر بھی خود عملی حصہ لیا۔عبادت صرف روتے رہنے کا نام نہیں۔تفریح کے موقعے پر ہنسنا اور خوش ہونا بھی عبادت ہے اور عین تقویٰ ہے۔حضورؐ مزاح و طیبت بھی فرماتے تھے۔مجمع احباب میں اشعار سن کر قدر افزائی فرماتے اور مسکرا بھی دیتے تھے۔اونٹ یا گھوڑے کی دوڑ میں بھی حصہ لیتے تھے۔ہتھیاروں کے کرتب دیکھ کر حوصلہ افزائی بھی فرماتے اور گانا اور دف سن کر اظہار خوشنودی بھی فرماتے تھے۔غرض زندگی کو تقشف و تشدد کی آہنی زنجیروں میں جکڑ کر کبھی نہیں رکھا۔اس قسم کی تمام روایات کو دیکھنے کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ فقط اتنا ہی نہیں کہ تفریحات میں (جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے) حصہ لینا جائز و مباح ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسا کرنا عین اتباع سنت نبویؐ ہے اور اس سے گریز خلاف سنت ہے۔زیادہ سے زیادہ اتنا کہا

جا سکتا ہے کہ جس کے ذوق پر کوئی تفریح گراں ہو وہ اس سے خود الگ رہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے ذوق سلیم کے مطابق اس میں حصہ لیتا ہے تو اسے مرتکب حرام قرار دینا ایک ایسی جسارت ہے جس کا حق کسی بڑے سے بڑے انسان کو بھی نہیں پہنچتا۔ یہاں وہی فرق پیدا ہوگا جو حلال و طیب میں موجود ہے۔ حلال وہ ہے جو قانوناً حلال ہو اور طیب وہ ہے جو آپکو اچھا لگے یا موافق آئے۔ دودھ حلال ہے لیکن کسی شخص کو پسند نہ آئے یا اسے موافق نہ آئے تو ساری عمر اس سے پرہیز کرنا بھی کوئی جرم نہیں۔ کیونکہ وہ اُسے طیب نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر اسے حلال بھی نہ سمجھے تو یہ کفر ہوگا۔

یہی صورت تفریحات کی ہے۔ آپ کو گانا بجانا پسند نہیں یا آپ کو اس سے کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ساری عمر نہ سنیے کیونکہ یہ آپ کیلئے طیب نہیں۔ لیکن اس کا حق نہیں پہنچتا کہ آپ سے حرام بھی قرار دیں۔ جو اُسے حلال کے ساتھ طیب بھی سمجھتا ہے وہ شوق سے سنے۔ اس پر نکیر اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک اس کا غلط استعمال نہ ہو رہا ہو۔ غلط استعمال تو اگر کوئی قرآن کا بھی کر رہا ہو تو اسے روک دیجیے۔ لیکن یہ کہیے کہ "قرآن ناجائز ہے کیونکہ بعض لوگ اس کو غلط محل پر استعمال کرتے ہیں"۔ تفریح ہو یا عبادت، ہر چیز کی کچھ حدود ہوتی ہیں اور ان حدود کے اندر ہی رہ کر اس کو برتنا چاہیے۔ کوئی شخص بالکل برہنہ ہو کر نفلیں پڑھے تو اسے نفل سے نہیں روکا جائے گا۔ صرف برہنگی سے باز رکھا جائے گا۔ اس لئے تفریحات میں خاص حدود کے اندر حصہ لینا نہ فقط مباح بلکہ بعض اوقات عین سنت ہے کیونکہ یہ زندگی کا ایک لازمی جز ہے اور توازنِ حیات اس کا شدت سے متقاضی ہے۔

دین اور عبادت

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دین ودنیا کی غلط اصطلاح

اخلاق کی طرف سے ہماری لاپرواہی کی ایک وجہ ”دین ودنیا“ کی اصطلاح بھی ہے جو دورغلامی میں ہمارے ذہنوں پر کچھ اس طرح سوار ہوگئی کہ اس نے زندگی کی وحدت کو دین اور دنیا کے علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا۔ اس طرح عملی زندگی میں ہم نے بہت سے کاموں کو دنیا داری قرار دے کر دین کی گرفت سے آزاد کرالیا اور اپنی کج فہمی کے باعث یہ فیصلہ کرلیا کہ دنیا داری کے میدان میں نیکی اور پارسائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ ہم پیچھے بیان کرآئے ہیں کہ دین سے مراد وہ مکمل آئین ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی گذارنے کیلئے انسانوں کو عطا فرمایا۔ اور دنیا حیات ارضی کا نام ہے اور اس کے مقابلے میں قیامت کے بعد نا ختم ہونے والی زندگی کا نام آخرت ہے جو اہل ایمان ہوتے ہیں وہ اس دنیا کی پوری زندگی اللہ کے آئین کے مطابق گذارتے ہیں جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے کیلئے اصولی ہدایات موجود ہیں۔ یعنی وہ دنیا کو دین کے تحت کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور آخرت کی زندگی کو نہیں مانتے وہ اس آئین یعنی اللہ کے دین کو بھی نہیں مانتے، اپنی زندگی کے ساری کام اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ مختلف قسم کے کاموں کا نام دین اور دنیا نہیں ہے۔ بلکہ کام سارے دنیا ہی کے ہیں اور اس زمین پر بسنے والے سارے انسانوں کو آپ دنیا دار کہہ سکتے ہیں اور اللہ کا دین وہ آئین ہے جو ہر خطا سے مُبرّا ہے اور جسے اپنانے سے دنیا اور آخرت دونوں سدھر جاتی ہیں۔ اس لئے میں یہ کہنے کی جسارت کرونگا کہ ”دین ودنیا“ کی یہ اصطلاح ہی غلط ہے کیونکہ اس کی ترکیب سے یہ تاثر جنم لیتا ہے کہ دین اور دنیا دو علیحدہ علیحدہ، متضاد اور ایک دوسرے سے مختلف چیزوں کا نام ہے۔ ہمیں قرآن کریم میں کہیں بھی نظر نہیں آئے گا کہ دنیا کو دین کے مقابلے میں بیان کیا گیا ہو بلکہ ہر مقام پر دنیا اور آخرت کو آمنے سامنے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دو زندگیاں ہیں ایک ہماری موجودہ حیات ارضی ہے جو گھٹیا ہے، ختم ہونے والی ہے اور ہمارے لئے تربیت گاہ اور آزمائش ہے۔ دوسری حیات آخرت ہے جو بہت بڑھیا اور نہ ختم ہونے والی ہے اور جہاں ہمیں ہمارے اعمال کی جزاوسزا ملے گی۔ لفظی اور لغوی طور پر بھی دنیا کے معنی ہی

ادھر، بزدیک والی، نچلی اور گھٹیا ہے۔ دنیا ادنیٰ کی مونث ہے جس طرح علیا اعلیٰ کی مونث ہے۔ یعنی اس کے مقابلے میں ایک اعلیٰ و برتر زندگی موجود ہے جو حیات آخرت ہے۔ اِسی لئے قرآن میں خسارہ اُٹھانے والے لوگوں کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اُنہوں نے دین کے کام چھوڑ کر دنیا کے کام کئے بلکہ یہ فرمایا **اَسْتَحَبُّوْا الحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ** (نحل ۔107) کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں عزیز رکھا۔ یہ بھی فرمایا کہ سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے لوگ وہ ہوں گے **اَلَّـذِیْـنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا** o(کہف ۔104)

جن کی ساری تگ ودو دنیا کی زندگی ہی کے لئے برباد ہوگئی ۔اسی طرح سورۃ اعلیٰ کے آخر میں فرمایا کہ ''تم لوگ تو حیات دنیا ہی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بہترین دعا میں **رَبَّـنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً** دنیا میں بھی بھلائیاں اور آخرت میں بھی بھلائیاں طلب کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ کہیں بھی دین مانگنے کا نہیں فرمایا کیونکہ وہ تو کامل صورت میں رسول اللہ ﷺ کے توسط سے عطا کیا جاچکا ۔اسی طرح جہاں کسی ناہنجار قوم کے انجام کا ذکر فرمایا وہاں **خَسِــرَ الــدُّنْیَــا وَالْاٰخِـرَۃِ** کہا گیا یعنی ان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہوگئیں۔ کہیں بھی دین برباد ہونے کا ذکر نہیں آیا کیونکہ اللہ کا دین برباد ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل ہم انسانی زندگی کی سرگرمیوں کو دین اور دنیا میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے ۔آپ قرآن وسنت کی روشنی میں غور فرمایئے کہ بچے کی پیدائش پر کانوں میں اذان دینا، سرمنڈانا، عقیقہ کرنا، ختنہ کرنا، بڑا ہونے پر اسے تعلیم واخلاق سے آراستہ کرنا، اسے کوئی ہنر سکھانا، جوان ہونے پر نکاح کا حکم، میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے تو مصالحت کا طریقہ، طلاق اور نکاح ثانی کے مسائل، رزق کمانے اور خرچ کرنے کی حدود، وفات پر جائیداد کی تقسیم کے قوانین، گھروں میں داخل ہونے، میل ملاقات، کھانے پینے، خلوت وجلوت اور سفر وحضر کے آداب، استنجا، وضو اور غسل کی تعلیم، مرد اور عورت کے ستر کی حدود، جرائم کے لئے سزاؤں کا تقرر، دوسری قوموں کے ساتھ صلح و جنگ کے قوانین، مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے بارے میں جو مفصل ہدایات دی گئی ہیں تو ان کاموں کو آپ دین کے کھاتے میں ڈالیں گے یا دنیا کے۔ اگر یہ سب کچھ دُنیا ہے تو پھر قرآن کریم اور سنت رسولؐ میں ان کی موجودگی کا کیا جواز ہے ۔اور اگر یہ سب کچھ دین ہے تو پھر دُنیا کس چڑیا کا نام ہے۔ دین و دنیا میں دوئی ہماری پست فکر نے پیدا کی اور اسی نے دینی علوم، دینی کام اور دینی فائدے جیسی مزید اصطلاحوں کو متعارف کرایا۔ درحقیقت دنیا کے کام بٹے ہوئے نہیں ہیں ۔بلکہ انسان دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ایک تو وہ ہیں

جواللہ اور یوم آخرت کے منکر ہیں اور اپنی زندگی خواہشات نفس کی پیروی میں اور اپنی مرضی کے مطابق گزارتے ہیں۔ یہی لوگ کافر اور خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لا کر اللہ کے دین کے تحت مولا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ یہ صاحب ایمان اور فلاح دارین حاصل کرنے والے ہیں۔ دین کی وسعت کا اظہار حضورﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتا ہے کہ ایمان کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں جن میں سب سے افضل کلمہ طیبہ کا اقرار ہے، حیاء بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے اور ان میں سب سے کمتر راستے میں سے کسی مضر چیز کا ہٹا دینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مکمل آئین میں زندگی سے متعلقہ تمام سرگرمیوں کے علیحدہ علیحدہ شعبے وقف ہیں۔ لہٰذا دین چند مخصوص اعمال کا نام ہرگز نہیں بلکہ چند ازلی و ابدی لیکن نظر نہ آنے والے حقائق (ایمان بالغیب) پر قائم ایک مکمل نظام حیات کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا کی زندگی احسن طریقے سے گذارنے کے لئے دیا تو پھر ان دونوں میں علیحدگی کا جواز کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ہمارے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ بھائی بھی اپنی کم کوشی اور بے عملی کا اظہار کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ جی ہم تو دنیا دار لوگ ہیں۔ میں ان سے یہی گذارش کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین ہم دنیا داروں کے لئے ہی بھیجا ہے تا کہ ہم اس زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے نہ پھریں۔ دین کی ضرورت جمادات، نباتات، حیوانات اور فرشتوں کو نہیں ہے لیکن ہمارے لئے اس کے بغیر کوئی چارا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا کہ اپنے رسولﷺ کو دین حق دے کر بھیجا۔ میں اپنے بھائیوں سے یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ کیا حضورﷺ کے صحابہؓ دنیا دار نہیں تھے؟ کون سے کام ہیں جو ہم ان سے زیادہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے شادیاں کیں اور ہم سے زیادہ کیں، ان کے بچے تھے اور ہم سے زیادہ تھے، وہ تاجر اور کسان تھے، مزدور اور گلہ بان تھے، صنعت کار تھے شاہسوار تھے، انہوں نے ہجرت کی، جنگیں لڑیں، حکمرانی کی، قاضی اور والی بنے، فوجوں کے سپہ سالار بنے، قوموں کے معلم اور رہنما بنے اور اللہ کا پیغام پھیلانے کے لئے دور دراز سفر کئے۔ بایں ہمہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ سب سے بلند ہے اور اس دنیا کی دولت اور نعمتیں بھی ان کے قدموں میں چلی آئی تھیں کیونکہ وہ مولا مرضی والے دنیا دار تھے اور ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور ہم جو بزعم خود دیندار ہیں وہ بھی من مرضی والے ہیں۔ اسی لئے ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے وظیفے اور چلے بلکہ بزرگوں سے عقیدت و احترام کا تعلق بھی دنیا ہی کی خاطر ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ دنیا ہم سے دور دور ہی رہتی ہے۔

ایسی ہی غلامانہ سوچوں نے نہ صرف ہماری روحانی اور اخلاقی حالت کو متاثر کیا بلکہ تعمیر و تسخیر

کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر کے سائنسی ترقی کو بھی منجمد کر دیا ہے۔ دین کو اس طرح محدود کر دینے کی وجہ سے زندگی کی سرگرمیوں کے دائرے سکڑتے چلے گئے اور شہ لولاک ﷺ کے شاہین کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ گئے۔ علامہ اقبال غلامی اور آزادی کی زندگی کا فرق بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

(بانگ درا)

عبادت کی حقیقت

اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے قرآن کریم کی ایک بنیادی اور نہایت ہی اہم اصطلاح ''عبادت'' پر کچھ روشنی ڈالیں گے تا کہ بہت سی غلط فہمیوں سے نجات حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ عربی لغت میں عبد کے معنی غلام ہیں۔ جو شخص کسی دوسرے کے تحت ہو اور اپنی مرضی کا مالک نہ ہو اُسے عبد کہا جاتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا صحیح مفہوم اپنی مرضی کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی غلامی کرنا ہے۔ ایک عارضی ملازم یا کرائے کا مزدور تو یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ مجھے کیا کام کرنا ہوگا یا کتنے گھنٹے کرنا ہوگا لیکن ایک غلام کے لئے اس قسم کی شرائط خارج از بحث ہیں کیونکہ اس کا آقا جس وقت بھی اسے جو کام کرنے کا حکم دے گا وہ اسے کرنا پڑتا ہے۔ حقیقی بندگی تو اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ میں اپنا تن من دھن بیچ ڈالنے کا نام ہے۔ اگرچہ بندگی کی یہ تشریح ہماری سوچوں سے کافی مختلف اور مشکل دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقی فلاح کے حصول کی خاطر ہمیں اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کو بدلنا ہی ہوگا۔ یہ تجارت تو بڑی ہی بابرکت اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے اموال جو اس نے ہمیں بغیر کسی استحقاق کے محض اپنے فضل سے عطا کر رکھے ہیں انہیں وہ بڑی اونچی قیمت کے بدلے خریدنے پر رضامند ہو جائیں اور اعلان فرمادیں۔

اِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ہ (التوبہ۔111)

”اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں کہ ان کے لئے جنت تیار کی ہے“

اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ دائرہ اسلام میں داخلہ گویا اپنی جان اور مال کے حقوق سے دستبرداری کا نام ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر اور آج کل ہم لوگ جو بزرگوں کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو گویا یہ اللہ تعالیٰ سے کئے جانے والے سودے کی توثیق ہے کیونکہ بیعت کی معنی ہی بیچ ڈالنے کے ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کو غلامی کے معنوں میں قبول کر لیں تو ہمارے ذہنوں کی پیدا کردہ دنیا کے کاموں اور دین کے کاموں والی تقسیم کا طلسم ٹوٹ جائے۔ کیونکہ جب ہم اللہ تعالیٰ کی غلامی میں داخل ہو جائیں تو پھر اپنی مرضی سے دستبردار ہو کر اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت رکھنے کے پابند ہونگے اور زندگی اس کی اطاعت کے لئے وقف ہو جائے گی۔ پھر یہ غلامی تو ذوق وشوق سے اختیار کی گئی اپنے حقیقی محبوب کی غلامی ہے اس لئے یہاں چون و چرا کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے۔

عبادت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ یہ ایک لفظ پورے نظام حیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اللہ کی بندگی پوری زندگی پر محیط انداز فکر اور طرز حیات کا نام ہے اور اس کا نام اللہ کا دین ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ اور رب تسلیم کر کے اس کی بندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ مسلم کہلاتے ہیں اور جو لوگ اللہ کی بندگی کے نظام میں داخل نہیں ہوتے وہ شیطان کے اتباع میں اپنے نفس کے غلام بن کر کفار کے دین یعنی کافرانہ طرز حیات کی پیرو بن کر دنیا و آخرت میں نقصان اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کریم کی ایک مختصر سورت **الْـكٰـفِـرُوْنَ** کی چھوٹی چھوٹی آیات پر غور و فکر کریں تو ہمیں نظر آئے گا اس میں عبادت کے علاوہ کسی دوسری بات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف عبادت کے مفہوم کو مختلف انداز میں آٹھ مرتبہ دہرایا گیا ہے اور آخر میں عبادت کے اختلاف کی بنا پر ہی کفار سے یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے ماسواء کی عبادت والا تمہارا دین تمہارے لئے اور اللہ کی عبادت والا میرا دین میرے لئے۔ معلوم ہوا کہ عبادت اور دین ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر صاف صاف فرما دیا گیا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ٥ (یوسف۔40)

”اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو

یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

ہم پیچھے یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے قرب کا حصول ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کیلئے صراط مستقیم کی نشاندہی ہو جانا سالکین راہ خدا کیلئے بہت بڑی نعمت ہے۔ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبد اور رسول ہیں اور آپ کیلئے سورۃ یاسین میں فرمایا گیا **اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** کہ بے شک آپ مرسلین میں سے ہیں اور صراط مستقیم پر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا اتباع ہی عبدیت ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔ دوسری جگہ مزید واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت یعنی اس کی غلامی اختیار کرلو کہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ٥

(آل عمران۔51)

''بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے تو اسی کی عبادت کرو یہی صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ ہے''

اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ عبادت کا دائرہ بہت ہی وسیع اور پورے دین پر محیط ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم بھی ہے۔ ہم نے بہت سی کج فہمیوں کی بناء پر صرف نماز کو عبادت سمجھنا اور کہنا شروع کر دیا۔ اگرچہ نماز اور دوسرے ارکان اسلام عبادت و دین کا بہت اہم حصہ ہیں کہ انہی سے وہ کردار تعمیر ہوتا ہے جس کی بدولت مومن معاملات میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو پیش نظر رکھتا اور اس کی نافرمانی سے بچتا ہے لیکن بنیادی ارکان ہی کو پورا دین سمجھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کے فرمان **اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ** کے مطابق اللہ تعالیٰ کی یاد کو قلب و ذہن میں تازہ رکھنے کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ اہل ایمان تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو کر اس کو اپنا رب یعنی آقا مان کر ہر رکعت میں یہ عہد کرتے ہیں کہ زندگی کی آزمائش گاہ میں صرف تیری غلامی کریں گے۔ اس طرح اللہ کے فرمان **اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ** کے مطابق نماز ہمیں فحشائے عظیم یعنی اپنے حقیقی آقا و مالک سے بے وفائی یعنی اسے چھوڑ کر دنیا کی محبت میں پھنس جانے اور برائیوں کے ارتکاب سے روک لیتی ہے۔ جس طرح اللہ کی ربوبیت میں کسی دوسرے کو شریک کرنا ظلم و ستم ہے اس طرح اللہ کو چھوڑ کر اس کے ماسوا کی محبت میں گرفتار ہو جانا سب سے بڑی بے غیرتی اور فحاشی ہے۔

اس کے علاوہ غور فرمایئے کہ ہمارے دین میں جو عمارت نماز کے لئے وقف ہوتی ہے اس

کا نام مسجد یعنی سجدہ گاہ ہے اور اسے معبد یعنی عبادت گاہ نہیں کہا گیا۔ کیونکہ عبادت کی وسعت تو ہماری تجارت، معاشرت، معیشت، عدالت، صنعت وحرفت، تعلیم تربیت، کاشتکاری، گلہ بانی اور حکمرانی سب کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ میری نبوت کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ ساری زمین کو میری اُمت کیلئے مسجد بنادیا گیا ہے۔ اس طرح جہاں اُمت مسلمہ کو مسجد کے باہر بھی ہر جگہ نماز ادا کر سکنے کی سہولت عطا ہوئی ہے وہاں اس پر یہ فرض بھی عائد ہو گیا کہ پوری زمین کو مسجد کی مانند مقدس ومحترم جانتے ہوئے کسی بھی جگہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کرے۔

اب ہم آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں جن میں صلوٰۃ اور عبادت کو واضح طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

(1) اِنَّنِی اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْo (طٰہٰ۔14)

''میں ہوں اللہ، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو اور میری یادگاری کیلئے نماز قائم کرو''۔

(2) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوْا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَo (الحج۔77)

''اے ایمان والو رکوع کرتے رہو اور سجدہ کرتے رہو اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تا کہ فلاح پاؤ''

(3) وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِo (البینہ۔5)

''اہل کتاب کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے''

ان آیات بینات کے علاوہ وتر کی نماز کے دوران دعائے قنوت میں ہم پڑھتے ہیں **اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ** جس کے معنی ہیں کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ عبادت کو قرآن کریم میں بیان کی گئی حقیقت کے مطابق پوری زندگی پر محیط سمجھیں اور اسے صرف نماز تک محدود کر کے نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں۔ (جاری ہے)

پیارے رسول ﷺ کی پیاری زبان

(محمد صدیق ڈار)

تعریف

فعل وہ کلمہ ہے جس سے کسی کام کا ہونا یا کرنا سمجھا جائے اور اس میں تین زمانوں میں سے کوئی زمانہ بھی پایا جائے۔ جیسے **فَتَحَ** (اُس نے کھولا) **یَرْکَبُ** (وہ سوار ہوتا ہے)۔ **کُلُوْا وَاشْرَبُوْا** (تم سب کھاؤ اور پیو)۔

اقسام مفعول کی ضرورت کے لحاظ سے فعل کی دو قسمیں ہیں۔

1۔ فعل لازم:۔ جس فعل کا مفعول نہ ہو اور فعل اور فاعل کے ملنے سے جملہ مکمل ہو جائے۔ جیسے **جَلَسَ زَیْدٌ** (زید بیٹھا)

2۔ فعل متعدی:۔ جو فاعل کے علاوہ مفعول کو بھی چاہتا ہے۔ جیسے **ضَرَبَ زَیْدٌ بَکَرًا** (زید نے بکر کو مارا)۔

☆ عربی میں عموماً پہلے فعل پھر فاعل اور پھر مفعول آتا ہے۔

☆ فاعل پر پیش اور مفعول پر زبر آتی ہے۔

جیسے **ضَرَبَ خَالِدٌ حَامِدًا** (خالد نے حامد کو مارا)

اَکَلَتْ جَمِیْلَۃُ خُبْزًا (جمیلہ نے روٹی کھائی)

رَفَسَ لَا عِبٌ کُرَۃَ الْقَدَمَ (کھلاڑی نے فٹبال کو ٹھوکر لگائی)۔

اسلامی انقلاب۔۔مساجد کی اہمیت اور کردار

(صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)

کہنے اور دیکھنے کو تو ایک مسجد محض عمارت ہوتی ہے اور بسا اوقات عام رہائشوں، گھروں اور کوٹھیوں کے مقابلے میں نسبتاً سادہ اور کم پر شکوہ ہوتی ہے اور پورا محلّہ اور علاقہ مل کر اسے تعمیر کرواتا ہے تا کہ اس میں اہل محلّہ مل جل کر عبادت کر سکیں، لیکن اس کی نسبت چونکہ اللہ تعالیٰ کے نام اور ذات سے ہوتی ہے اس لئے اس کا تقدس، مقام اور مرتبہ اس سے بیچا سوگنا بڑھ کر قیمتی بنگلے سے بھی زیادہ ہوتا ہے، پارلیمنٹ کی بلڈنگ ہو یا ایوان صدر وزیراعظم ہاؤس ہو یا گورنر ہاؤس، یہ اپنے تمامتر دبدبے، شان وشکوہ، آرائش وزیبائش، بلند قامت اور بیش قیمت ہونے کے باوجود بہر حال ان انتساب انسان جیسی فانی شخصیت سے ہوتا ہے اس لئے ان کی چمک دمک رنگ روغن، نقشہ اور نمونہ امارت واقتدار کا پتہ تو دیتا ہے مگر انکی حیثیت تقدس مآب ہرگز نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ ان بلند وبالا اور چمکدار بنگلوں میں مکین اور دوسرے لوگ جوتا پہنے رہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر تھوک بھی لیتے ہیں، بغیر وضو کے بھی رہتے ہیں، زبان وبیان کی لغزشیں بھی روا ہوتی ہیں۔ مگر کچی اور معمولی قیمت کی مسجد میں عام آدمی سے لے کر صدر اور گورنر تک داخل ہوتے ہوئے جوتے باہر اُتاریں گے، کہیں تھوک نہیں سکتے، زبان سے غیر محتاط لفظ نہیں نکال سکتے اور وضو ہونا بھی ضروری ہوتا ہے، یہ سب لوازمات عمارت کے باعث نہیں بلکہ اس نسبت کے سبب ہیں جو مسجد کو خدا اور رسول کے ساتھ ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلاب اور اسلامی نظام میں مسجد کو ایک خاص اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوتی ہے اور مسجد ہر لحاظ سے مسلم معاشرے میں ایک ''اعصابی مرکز'' کی حیثیت رکھتی ہے مسجد کی تعمیر اور قیام چونکہ عبادت کیلئے ہوتا ہے اور عبادت اسلام کے اندر ایک بھرپور اسلامی زندگی بسر کرنے کا نام ہے اور وسیع تر معنوں میں اللہ اور اس کے بندے کے درمیان رابطے کا مکمل پروگرام ہے اس لئے عبادت کے اس مفہوم نے عبادت کی جگہ ''مسجد'' کو منفرد، ہمہ گیر اور بہت ہی بلند مقام کا حامل بنا دیا ہے۔

جس طرح دنیا کے کسی بھی فرد کی زندگی میں ترجیحات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے کیا

کرے؟ کیا بنائے؟ اور کس طرح اپنے کام کا آغاز کرے؟ اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کے ہاں بھی ترجیحات میں پہلا نمبر مسجد کی تعمیر اور قیام کا تھا۔ گھر کہاں ہو اور کیسا ہو؟ رہائش کا طرز اور نمونہ کیا ہو؟ یہ آپؐ کے نزدیک ثانوی درجے کی چیزیں تھیں اور پھر کوئی بڑا آدمی کروڑوں کی بلڈنگ بناتے وقت خود نگرانی کا کام کرتا ہے۔ کام میں ہاتھ نہیں بٹاتا مگر حضور اکرم ﷺ نے مسجد کی تعمیر میں پہلی اینٹ خود اُٹھائی، مزدور بن کر کام میں شریک رہے، کیونکہ اللہ کے لئے اور اس کے نام پر ہونے والے کسی بڑے اور ادنیٰ کام میں عار کا کوئی تصور نہیں، یہ سارے وہ حوالے ہیں جو مسجد کے تقدس، اس کے مرتبے اور اس کی اہمیت کی دلیلیں ہیں، مسجد ہی مسلم معاشرہ کا وہ واحد مرکز اور شعار ہے جہاں (خواہ وقتی طور پر سہی) ایک مسلمان محض اللہ کا بندہ نظر آتا ہے اور اللہ کے بندے ہونے کا مطلب اس کا یکسو ہونا، منکسر المزاج ہونا، متحد الفعل والعمل ہونا، طاہر و مطہر ہونا، طبقاتی اونچ نیچ سے مبرا ہونا، غیر اللہ کے خیال سے بے نیاز ہونا، اپنے اعضاء اور زبان و بیان پر نگاہ رکھنا اور بس انسان اور اللہ کا بندہ نظر آنا، یہ سب محاسن صرف مسجد کے اندر ہی پیدا اور ظاہر ہوتے ہیں، کوئی مسلمان جب مسجد کے اندر عبادت کی نیت سے داخل ہوتا ہے تو پاک صاف ہوتا ہے، اپنے مقصد اور اس کے طریق کار سے آگاہ اور اس میں یکسو ہوتا ہے، نمازیوں کی پوری جماعت میں اتحاد فکر و عمل ہوتا ہے سبھی ایک ساتھ قیام، رکوع، سجود اور قعدہ کر رہے ہوتے ہیں، کوئی آقا اور غلام نہیں ہوتا۔ سب کی پیشانیاں بارہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوتی ہیں، صدر اور اس کا گن مین ایک صف میں بلکہ کبھی چپڑاسی اگلی اور اور افسر پچھلی صف میں ہوتا ہے اور چپڑاسی کے پاؤں کے تلوے اور افسر کے سر کی چوٹی برابر ہوتی ہے۔ کوئی مسلمان مسجد میں زبان و بیان کی غیر محتاط روش کا اظہار نہیں کر سکتا، وہاں سب اللہ سے مانگنے والے ہوتے ہیں اس کی کیفیت میں کسی دوسرے انسان کی عظمت بڑائی، اس کے نفع یا نقصان پہنچانے کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آتا، وہ سب بندے ہوتے ہیں اور ان کی توجہ کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ!

نبی اکرم ﷺ نے کمال حکمت و تدبر سے اپنے دور حکومت میں مسجد کو ہمہ نوعی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، تا کہ اللہ کے نام پر برپا ہونے والے انقلاب کے بعد بندوں کا اپنے اللہ سے ہمہ وقت

رابطہ استوار رہے اور متذکرہ صدر خوبیاں صرف مسجد کی چہار دیواری کے اندر اور عبادت کے وقت ظاہر نہ ہوں بلکہ انسانی سیرت کا جزو اعظم اور لازمی حصہ بن جائیں، آپ کے مسعود و مبارک دور میں نماز مسجد میں ہوتی تھی، درس و تدریس کیلئے بھی مسجد تھی، فصل نزاعات (احتساب و عدل) بھی مسجد کے اندر ہوتے تھے، نکاح مسجد میں پڑھایا جاتا تھا، سفیروں اور وفود سے ملاقات بھی مسجد ہی میں ہوتی تھی، غیر ملکی مہمانوں کا قیام بھی مسجد کے کسی کونے میں ہوتا، الغرض مسئلہ خواہ کسی نوعیت کا ہو اس کے حل کی بہترین جگہ مسجد تھی یعنی اللہ کا گھر! جب تمام انسان بندے اللہ کے ٹھہرے تو ان کی توجہ کا مرکز بھی اللہ کا گھر ہونا چاہئے تا کہ ہر معاملے، ہر قضیئے اور ہر فیصلے میں اللہ کے گھر کی برکت اور اللہ کا فضل شامل حال رہے اور یوں بے پناہ مشکلات میں انسان گھبرا نہ جائے۔

یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب اسلام اور اس کا نظام اپنی پوری شان کے ساتھ خدا کی دھرتی پر قائم تھا اور انسان آج کی طرح اپنے پیدا کرنے اور پالنے والے مہربان رب سے دور نہیں ہوا تھا اور اس کے گھر سے وحشت زدہ اور اپنے مقصد زیست سے بیگانہ نہیں تھا، البتہ مسلمان معاشرے کے مجموعی زوال اور لامرکزیت نے جہاں اور بہت سی خرابیاں اور تہذیبی و ثقافتی پیچیدگیاں پیدا کیں وہاں مسجد کا حساس منصب اور مرکزی کردار بھی مجروح ہوا اور مسجد کو محض ''عبادت خانہ'' کا درجہ دے دیا گیا، جہاں آج بھی مسلمانوں کے سر تو بارگاہ خداوندی میں جھکتے ہیں مگر دل پوری طرح مائل نہیں رہا، اذان کی آواز تو گونجتی ہے مگر ''اذان بلالی ﷺ'' کا تاثر نہیں ملتا، محراب کا رُخ تو صحیح ہے مگر سوچ، عمل اور عقیدے کی سمت درست نہیں رہی، مسجد کی دیواریں، فرش، چھت اور گنبد تو پختہ ہو گئے ہیں نمازیوں کا کردار پختہ نہیں رہا، مسجد کے مینار تو بلا شبہ بلند و بالا ہیں مگر اہل مساجد کا ذہن پست ہو گیا ہے مسجدوں کے ہال فانوسوں اور قمقموں سے جگمگا رہے ہیں مگر ہماری سوسائٹی اندھیروں کی نذر ہو گئی ہے، قرات و تجوید کے لہجے تو نفیس ہو گئے ہیں مگر عبادت گذاروں کے لہجوں میں تلخی آئی بلکہ بڑھتی جا رہی ہے، اس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ مسجد ''عبادت خانہ'' تو ہے مگر اس کا متحرک اور جاندار کردار فراموش کر دیا گیا اور دین و دنیا کی شوکت نے مرکز کو ڈھا کر اپنے لئے الگ الگ خانے تعمیر کر لئے ہیں سیاست اور مسجد، بازار اور مسجد، مسند

اقتدار اور مسجد انداز معیشت اور مسجد، طرز معاشرت اور مسجد نظریہ ثقافت اور مسجدان سب میں کوئی رابطہ باہمی اور حسن سلوک نہیں رہا، اہل دنیا فرنگی بتکدے میں کھو گئے ہیں اور اہل مذہب تہ محراب مسجد سو گئے ہیں، وہ اپنے فرض سے غافل اور یہ اپنے منصب سے بے خبر ہو چکے ہیں۔

حالانکہ مسجد ایک کثیر المقاصد ادارہ ہے۔ایک ہی وقت میں روحانی تربیت گاہ، سیاسی مرکز، ثقافتی دائرہ اور علمی دانشگاہ ہے، دنیا کے احوال و معاملات میں بلا شبہ جامعات اور اداروں کا بڑا مثبت دخل رہا ہے مگر سب سے بڑی جامعہ اور ادارہ تو خود مسجد ہے، کیمبرج، آکسفورڈ، سوربون، کیلیفورنیا اپنی آغوش سے وہ انسان پال پوس اور بنا کر سنوار کر نہیں نکال سکیں جو مسجد نبویؐ بے مثال انقلابی کردار کے حامل انسانوں کی ایک کھیپ دنیا کو عطا کر چکی ہے، ایک سے ایک بڑھ کر اچھا انسان! مجسم صداقت، سراپا عدالت، پیکر حیا اور دبستان علم وحکمت، ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ یہ سبھی آغوش مسجد کے پروردہ اور دامن مسجد کے فیض یافتہ ہیں، کوئی ان سے بڑھ کر کیا دنیا کو صداقت کا نمونہ پیش کر سکے گا، عدل کی بہار دکھا سکے گا، حیاء کا معیار سامنے رکھ سکے گا اور علم و حکمت کے نکتے سمجھا سکے گا۔

آج بھی تمام تر اُلجھنوں اور فکری و عملی لغزشوں اور معاشرتی پیچیدگیوں کے باوجود مسجد کے توسط سے گرانقدر کام سرانجام دیئے جاسکتے ہیں اس لئے لازم ہے کہ دوسرے خام تجربے چھوڑ کر معاشرے میں ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے اور اخلاقی وفکری تبدیلی لانے کیلئے مسجد کو حساس مرکز اور کنٹرول روم کا درجہ دینا چاہئے۔

جمود اور مرگ آسا سکوت توڑنے کا کام بھی مساجد میں زندگی کی نئی لہر دوڑا کر لیا جانا چاہئے، معاشرے میں اسلامی روح پیدا کرنے کیلئے مسجد کے پلیٹ فارم کو زیادہ باوقار، پرکشش اور موثر بنانا چاہئے، ایسے بیدار مغز، روشن خیال اور راست فکر خطیب پیدا ہونے چاہئیں، جو مسجد کے ذریعے لوگوں کو ان کے معاشرتی و ملی فرائض سے آگاہ کریں تاکہ طاغوتی کے بجائے خدائی معاشرہ فروغ پذیر ہو سکے۔

حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح (امین الأمت)

طالب الہاشمی

۸ھ ہجری میں مکہ معظّمہ پر پرچم اسلام بلند ہوا اور پھر غزوہ حنین میں بنو ہوازن کو عبرتناک شکست ہوئی تو سارے قبائل عرب پر اسلام کی قوت وشوکت کی دھاک بیٹھ گئی اور عرب کے کونے کونے سے مختلف قبیلوں کے وفود جوق در جوق بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہونے لگے۔کوئی حلقہ بگوش اسلام ہونے کیلئے اور کوئی معاہدہ صلح وامن کیلئے ۹ھ ہجری میں تو اس کثرت سے وفود آئے کہ اس سال کا نام ہی ''عام الفوذ''(وفد کا سال) پڑ گیا۔ان وفود میں اہل نجران کا وفد بھی تھا جن کا تاریخ اسلام میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔نجران مکہ معظّمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع تھا جہاں عیسائی عرب آباد تھے۔انہوں نے نجران میں ایک عظیم الشان کلیسا بنا رکھا تھا جسے عرب بھر میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی مرکز سمجھا جاتا تھا۔اس کلیسا میں عیسائیوں کے دو بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے جن میں سے ایک کا لقب عاقب تھا اور دوسرے کا سید۔۹ھ ہجری میں ساٹھ آدمیوں پر مشتمل اہل نجران کا ایک وفد عاقب اور سید کی سرکردگی میں بڑی شان وشوکت سے مدینہ آیا۔سرورِ عالمﷺ ان لوگوں کے ساتھ بڑی عزت وتکریم سے پیش آئے اور ان کو نہایت بلیغ انداز میں اسلام کی دعوت دی۔لیکن قبولِ حق کے بجائے انہوں نے کج بحثی شروع کر دی۔اس پر بارگاہِ خداوندی سے حکم نازل ہوا کہ:۔

(اے رسول) جو شخص علم آنے کے بعد آپ سے جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دیں کہ آؤ ہم اپنی اولاد کو بلاتے ہیں تم اپنی اولاد کو بلاؤ اسی طرح ہماری عورتیں اور تمہاری عورتیں، ہم خود بھی اور تم خود بھی جمع ہوں۔پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دُعا کریں کہ ہم میں جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ (سورہ آل عمران۔ع:٦)

اس حکم کے مطابق حضورﷺ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت حسنؓ وحسینؓ کو لے کر مباہلہ کیلئے نکلے تو نجران کے سرداروں میں سے ایک نے کہا کہ مباہلہ ہرگز نہ کرنا اس لئے کہ اگر وہ حقیقتاً نبی ہیں تو پھر ہم ہمیشہ کیلئے تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔چنانچہ اہل نجران نے حضورﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم آپؐ کی اطاعت کرتے ہیں آپؐ ہم سے جو خراج چاہیں لے لیں ہم ہمیشہ

دیتے رہیں گے۔آپ کسی امین آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیجئے۔

حضورﷺ نے فرمایا، ''میں تمہارے ساتھ ایسے امین کو بھیجوں گا جو انتہا درجے کا (حقیقی معنوں میں) امانت دار ہے''۔

حضورﷺ کا ارشاد سن کر وہاں پر موجود تمام صحابہؓ نہایت شوق سے دیکھنے لگے کہ یہ شرف کس خوش بخت کو نصیب ہوتا ہے۔

رحمت عالمﷺ نے اپنے ایک جانثار کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور انکا نام لے کر فرمایا، ''کھڑے ہو جاؤ''۔

کشیدہ قامت کے یہ نحیف و لاغر صاحب رسول جن کے چہرے پر نور کی بارش ہو رہی تھی، ارشاد نبویؐ کی تعمیل میں فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

حضورﷺ نے ان صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہل نجران سے مخاطب ہو کر فرمایا

''**ھذا امین ھذہ الامت**'' یہ اُمت کے امین ہیں۔

یہ صاحبؓ رسولؐ جن کو لسانِ رسالتؐ سے ''**امین الامت**'' کا مہتمم بالشان لقب مرحمت ہوا سیدنا حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح تھے۔

سیدنا حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح، خیر البشرﷺ کے ان جانثاروں میں سے ہیں جن کا شمار اساطین اُمت میں ہوتا ہے۔وہ السابقون الاولون، مہاجرین اولین، اصحاب بدر، اصحاب عشرہ مبشرہ اور اصحاب الشجرہ میں سے ایک ہیں۔فی الحقیقت عہد رسالتؐ کا کوئی بڑے سے بڑا شرف ایسا نہیں جو ان کو حاصل نہ ہوا ہو۔ان کے فضائل و مناقب اور کارہائے نمایاں کا تذکرہ پڑھ کر سر عقیدت بے اختیار ان کی عظمت کے سامنے خم ہو جاتا ہے۔

اصل نام عامر تھا لیکن انہوں نے اپنی کنیت ابوعبیدہ سے شہرت پائی۔اِسی طرح والد کا نام عبداللہ تھا لیکن وہ دادا کی نسبت سے ''ابن الجراح'' مشہور ہوئے۔

حضرت ابوعبیدہؓ کا لقب ''امین الامۃ'' ہے جو انہیں لسانِ رسالتؐ سے عطا ہوا اور ''امین'' وہ لقب ہے جو قرآنِ حکیم میں بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں کے نام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

خاندانی تعلق ''بنوفہر'' سے تھا جو بقول ابن سعدؒ قریش کی آخری شاخ ہے۔سلسلہ نسب یہ ہے:

عامرؓبن عبداللہ بن جراح بن ہلال بن اہیب بن ضبۃ بن حارث بن فہر۔
فہر پر سلسلہ نسب رسول اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے۔
والدہ کا نام اُمیمہؓ بنت غنم فہریہ تھا۔ان کو بھی قبولِ اسلام اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔
بروایت ابن اسحاقؒ، حضرت ابوعبیدہؓ ہجرتِ نبوی سے ۲۲ سال قبل پیدا ہوئے لیکن واقدی کا بیان ہے کہ وہ ہجرت سے چالیس سال قبل پیدا ہوئے۔ابن مندرؒ نے واقدی کے بیان کو درست تسلیم کیا ہے اور جمہور اہل سیر نے بھی اسی روایت کو ترجیح دی ہے۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے بعثت نبوی کے ابتدائی زمانے میں قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا۔اس وقت تک معدودے چند بزرگوں ہی نے دعوتِ حق قبول کی تھی اور رسول اکرم ﷺ نے ابھی دارِ ارقم میں قیام نہیں فرمایا تھا۔ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ صدیق اُمت حضرت ابوبکرؓ کی دعوت وتبلیغ پر سعادت اندوزِ اسلام ہوئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب دعوتِ حق قبول کرنا آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔اس دعوت پر لبیک کہنے والے مشرکین کے ظلم وجور کا ہدف بن جاتے تھے اور ان پر جینا دوبھر ہو جاتا تھا۔قبولِ حق کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ بھی بلاکشانِ اسلام کی صف میں شامل ہو گئے۔جب حضور ﷺ نے مظلوم صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تو بقول ابن اسحاقؒ اور واقدیؒ حضرت ابوعبیدہؓ بھی حبشہ جانے والے مہاجرین کے دوسرے قافلے میں شامل ہو گئے اور وہاں کئی سال تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔بالآخر حضور ﷺ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصہ پہلے مکہ واپس آ گئے۔ ۱۳ بعد بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے صحابہؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا اذن دیا تو حضرت ابوعبیدہؓ بھی دوسرے مہاجرین کے ہمراہ ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ آ گئے۔واقدیؒ کا بیان ہے کہ ہجرت کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ قباء میں حضرت کلثومؓ بن الہدم کے مکان میں قیام کیا۔

مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے کے چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو ابن اسحاق اور حافظ ابن حجرؒ کے بقول آپؐ نے حضرت ابوعبیدہؓ کا انصاری بھائی سید الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ کو بنایا۔اکثر مورخین نے اسی روایت کو اپنایا ہے لیکن صحیح مسلم میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوعبیدہؓ بن جراح اور

ابوطلحہؓ کے درمیان مواخاۃ قائم کی۔ (کتاب الفضائل باب مواخاۃ النبیؐ)

قرآئن سے یہی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تقریب مواخاۃ، راوی یعنی حضرت انسؓ ہی کے مکان پر منعقد ہوئی تھی اور حضرت ابوطلحہؓ اُن کے سوتیلے باپ تھے۔

غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ راہِ حق کے سرفروش سپاہی ثابت ہوئے۔ انہوں نے ہر معرکے میں جانبازی اور فدا کاری کا حق ادا کر دیا اور اپنے جوشِ ایمانی کے بے مثال نقوش صفحہ تاریخ پر ابدالآباد تک کیلئے ثبت کر دیئے۔

صحیح بخاری میں اصحابِ بدر کی فہرست میں حضرت ابوعبیدہؓ کا نام نہیں ہے۔ لیکن ابن سعدؒ، ابن عبدالبرؒ، ابن اثیرؒ اور بعض دوسرے اہل سیر نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کفر و حق کے معرکہ اول میں نہ صرف شریک تھے بلکہ انہوں نے اس لڑائی میں اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا جو مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا۔ بعض دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی اس موقع پر راہِ حق میں اپنے قریبی عزیزوں کو قتل کیا۔ مفسرین نے لکھا ہے ایسے ہی صحابہ کرامؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:۔

لا تجد قوما یومنون باللّٰہ والیوم الاخر یوا دون من حاد اللّٰہ و رسولہ ولو کانوا اباء ھم او ابناء ھم او اخوانھم او عشیر تھم۔ اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ٥

(سورہ مجادلہ رکوع:۳)

(تو ایسی کوئی قوم نہ پائے گا جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر بھی ایمان لاتی ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے مخالفین سے بھی محبت رکھتی ہو خواہ ایسے لوگ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا ان کے خاندان میں سے ہوں۔ یہی (مومن) ہیں۔ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور اپنے فیضانِ غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔)

۳ھ ہجری میں غزوہ اُحد پیش آیا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے اس میں نہایت جوش و وارفتگی سے دادِ شجاعت دی اور شروع سے اخیر تک ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا کہ اس غزوہ کے ابطال خاص میں شمار ہوئے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور سرورِ عالم ﷺ زخمی ہو گئے تو

حضرت ابوعبیدہؓ بے تاب ہو گئے اور اپنے عشق رسولؐ کا حیرت انگیز ثبوت دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ:

''میں نے دیکھا کہ ایک شخص رسول ﷺ کو اکیلا پا کر مشرق کی جانب سے ایک پرندے کی طرح فضا میں پرواز کرتا ہوا تیزی سے حضور ﷺ کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میں بھی آپ کی حفاظت کیلئے تیزی سے بھاگا اور کہا کہ الٰہی خیر ہو۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص جو مجھ سے پہلے پہنچ چکا ہے، ابوعبیدہؓ بن الجراح ہے۔ اس موقع پر ایک کافر کے وار سے خود کی کڑیاں رسول اللہ ﷺ کے رخسار مبارک میں دھنس گئی تھیں ابوعبیدہؓ نے آگے بڑھ کر یہ کڑیاں اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچیں یہاں تک کہ وہ باہر آ گئیں لیکن اس کوشش میں ابوعبیدہؓ کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ گئے''۔

(طبقات ابن سعدؒ)

غزوہ اُحد کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے غزوہ احزاب میں دادِ شجاعت دی اور پھر بنو قریظہ کی سرکوبی میں سرگرم حصہ لیا۔

ربیع الثانی ۶ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو قبیلہ ثعلبہ و انمار کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔ یہ لوگ اکثر اطراف مدینہ میں غارت گری کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے چالیس مجاہدین کے ساتھ ان غارت گروں کے مرکزی مقام ذی القصہ پر چھاپا مارا۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ہمت نہ پڑی اور وہ بھاگ کر پہاڑوں میں چھپ گئے البتہ ایک آدمی مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ اس کو مدینہ لائے تو اس نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ اِسی سال حضرت ابوعبیدہؓ کو حدیبیہ کے مقام پر بیعت رضوان میں شریک ہونے کا عظیم الشان شرف حاصل ہوا۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ صلح نامہ حدیبیہ پر جن اصحاب نے بطور گواہ اپنے دستخط کیے حضرت ابوعبیدہؓ بھی ان میں شامل تھے۔

اوائل ۷ھ میں حضرت ابوعبیدہؓ نے غزوہ خیبر میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور لڑائی میں اپنی تلوار کے خوب جوہر دکھائے۔ غزوہ خیبر کے کچھ عرصہ بعد حضورؐ کو خبر ملی کہ قبیلہ قضاعہ کے لوگ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو تین سو مجاہدین کے ساتھ ان کی سرکوبی کیلئے روانہ کیا۔ حضرت عمروؓ نے بنو قضاعہ

کے علاقے میں پہنچ کر ''سلاسل'' نامی ایک چشمے پر قیام کیا اور وہاں سے حضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے کمک بھیجی جائے۔ سرورِ عالم ﷺ نے پیغام ملتے ہی دوسو مجاہدین حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں مدد کیلئے روانہ کر دیئے۔ ان مجاہدین میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے عظیم المرتبت بزرگ بھی شامل تھے۔ جب یہ کمکی فوج حضرت عمروؓ بن العاص کی فوج سے مل گئی تو تمام لشکر کی امارت کا سوال پیدا ہوا۔ حضرت ابوعبیدہؓ اگرچہ اپنے مرتبے اور شان کے لحاظ سے پوری طرح امارت کے مستحق تھے لیکن جب حضرت عمروؓ بن العاص نے اصرار کیا کہ میں ہی ساری فوج کی قیادت کروں گا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے خوش دلی سے ان کی قیادت قبول کر لی۔ اور ان کی زیرِ امارت نہایت بہادری سے دشمنوں کے خلاف لڑے یہاں تک کہ انہیں شکست ہوگئی۔ جب مظفر و منصور مدینہ واپس آئے اور حضور ﷺ نے امارت کے اختلاف اور ان کی اطاعت کی کیفیت سنی تو فرمایا۔

رحمه الله ابا عبيده ''ابوعبیدہؓ پر اللہ کی رحمت ہو''۔ (مدارج النبوۃ جلد۲)

تاریخ میں یہ واقعہ ''سریہ ذات السلال'' کے نام سے مشہور ہے۔

رجب ۸ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو تین سو سواروں کے ساتھ ساحلِ بحر کی طرف بھیجا کہ قریش کے قافلوں کی نقل و حرکت کا پتہ چلائیں۔ تاریخ میں یہ مہم سریہ سیف البحر یا سریہ خبط کے نام سے مشہور ہے۔ سیف البحر (سمندر کا کنارہ) اس لئے کہ مجاہدین کو سمندر کے ساحل پر قیام کرنا پڑا اور خبط اس لئے کہ اس مہم میں سامان رسد ختم ہوجانے کے باعث مجاہدین کو درختوں کے پتوں پر گزارہ کرنا پڑا اور جو پتے لکڑی وغیرہ مار کر درختوں سے جھاڑے جاتے ہیں ہیں انہیں خبط کہتے ہیں۔ ان اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کے ماتحت لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ بھی شامل تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ انصاری نے اس مہم کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے ایک مہم ساحل کی طرف بھیجی اور اس پر ابوعبیدہؓ بن الجراح کو امیر بنایا، ۳۰۰ آدمی تھے۔ ہم چلے کچھ راستہ طے ہوا تھا کہ زادِ راہ ختم ہوگیا صرف کھجور کی دو تھیلیاں بچیں، ابوعبیدہؓ روزانہ ہم کو تھوڑی تھوڑی کھجوریں دیتے تھے یہاں تک کہ ایک ایک کھجور پر نوبت آ گئی۔

بھوک کی سخت تکلیف ہوئی تو ہم درختوں کے پتے جھاڑ جھاڑ کر کھائے۔ایک شخص نے تین اونٹ ذبح کرائے، پھر تین اونٹ ذبح کرائے، تیسرے دن بھی تین اونٹ ذبح کرائے پھر ابوعبیدہؓ نے ان کو منع کر دیا۔سمندر کے کنارے اثنائے قیام میں ایک دن ٹیلے کے برابر ایک بہت بڑی مچھلی نکلی اس کو عنبر کہتے ہیں۔ہم نے نصف ماہ (یا ۱۸ دن) اس کو کھایا اور اس کا تیل ملا یہاں تک کہ ہم توانا ہو گئے۔پھر ابوعبیدہؓ نے اس کی دو پسلیاں کھڑی کرائیں اور ایک اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ان پسلیوں کے نیچے سے نکل گیا۔جب ہم واپس مدینہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رزق بھیج دیا اس کو کھانا چاہئے تھا، اگر تمہارے پاس ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ۔ایک شخص (کچھ گوشت) لے آیا اور آپؐ نے اسے تناول فرمایا''۔

اس روایت میں اونٹ ذبح کرانے والے جن صاحب کا ذکر ہے وہ حضرت قیسؓ بن سعدؓ انصاری تھے جو بالطبع نہایت کشادہ دست اور فیاض تھے۔

رمضان ۸ ہجری میں حضرت ابوعبیدہؓ نے غزوۃ الفتح میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق مکہ میں داخل ہونے والے لشکر کے ایک حصے کی امارت حضرت ابوعبیدہؓ کے سپرد تھی۔یہ حصہ فوج زرہ پوش مجاہدین پر مشتمل تھا۔فتح مکہ کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حنین اور طائف کے معرکوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور جانبازی کا حق ادا کر دیا۔

۹ ہجری میں وفد نجران کی آمد کے موقع پر حضرت ابوعبیدہؓ کو بارگاہِ رسالت ﷺ سے ''امین الامت'' کا عظیم الشان لقب مرحمت ہوا جس میں کوئی اور ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجران کا وفد نجران کی آمد کے موقع پر ''امین الامۃ'' کا لقب عطا ہوا۔صحیح مسلم میں اہل نجران کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ ''ابوعبیدہؓ ہمیں سنت اور اسلام کی تعلیم دیتے تھے''۔اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل نجران نے اسلام قبول کر لیا تھا اور حضرت ابوعبیدہؓ ان کو احکام دین کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان سے صدقات بھی وصول کرتے تھے۔اِسی سال نجران سے واپسی کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ ان کو احکام دین کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان سے صدقات بھی وصول کرتے تھے۔اسی سال نجران سے واپسی کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ کو بحرین جانا پڑا۔اسی

سلسلہ میں صحیح بخاری میں حضرت عمروؓ بن عوف سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوعبیدہ کو محصل جزیہ بنا کر بحرین بھیجا۔ حضورﷺ نے اہل بحرین سے صلح کر لی تھی اور ان پر علاءؓ بن الحضرمی کو امیر بنایا تھا۔ ابوعبیدہؓ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار کو ان کی مراجعت کی خبر ملی تو فجر کی نماز حضورﷺ کے ساتھ پڑھی جب آپؐ نماز پڑھ چکے تو انصار کا (غیر معمولی) مجمع دیکھ کر متبسم ہو گئے اور فرمایا، شاید تم لوگوں کو ابوعبیدہ کے آنے کی اطلاع ہو گئی ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا، ہاں یا رسول اللہ، حضورﷺ نے فرمایا بشارت ہو کہ آج تمہیں خوش کر دوں گا لیکن خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر و افلاس کا خوف نہیں ہے البتہ یہ خوف ضرور ہے کہ جس طرح پہلی قوموں پر دنیا کشادہ کر دی گئی اور باہمی منافست اور حسد و طمع نے ان کو ہلاک کر دیا، اِسی طرح تم پر بھی دنیا کشادہ کر دی جائے اور تم بھی باہمی منافست میں مبتلا ہو کر برباد نہ ہو جاؤ۔

۱۰ھ ہجری میں حضرت ابوعبیدہؓ نے حجۃ الوداع میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی تو حضرت ابوعبیدہؓ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا تاہم اُنہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورﷺ کے وصال کے فوراً بعد انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کا سوال اُٹھایا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ انصار سے گفتگو کیلئے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اثنائے گفتگو میں حضرت ابوعبیدہؓ نے انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

''اے گروہِ انصار تم نے سب سے پہلے اسلام کی امداد و اعانت کی اب تم ہی افتراق و اختلاف کی بنیاد نہ رکھو''۔

جب دونوں طرف سے تقریریں ہو چکیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، میں تمہارے لئے ان دو شخصوں (حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ) میں سے کسی ایک کو پسند کرتا ہوں تم ان دونوں میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو، لیکن ان دونوں بزرگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی موجودگی میں بارِ خلافت اُٹھانے سے انکار کر دیا اور بڑھ کر سب سے پہلے صدیق اکبرؓ کی بیعت کر لی۔ ان کے بعد سارا مجمع بیعت کیلئے ٹوٹ پڑا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مسند آرائے خلافت ہونے کے معاً بعد سارے عرب میں فتنہ ارتداد کے شعلے بھڑک اُٹھے۔صدیق اکبرؓ نے اس ہولناک فتنے کا بڑی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اوردس ماہ کے اندر اندر اس کا استیصال کردیا۔اس پُر آشوب دور میں حضرت ابوعبیدہؓ برابر خلیفۃؓ الرسولؐ کے دست و بازو بنے رہے۔فتنہ ارتداد کے فرو ہونے کے کچھ عرصہ بعد شام اور ایران سے معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۱۳ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام پر مختلف اطراف سے لشکر کشی کا اہتمام کیا اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو حمص کی طرف، حضرت عمروؓ بن العاص کو فلسطین کی طرف، حضرت شرجیلؓ بن حسنہ کو اردن کی طرف اور حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو دمشق کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ اگر میدانِ کارزار میں تم سب کو یکجا ہونا پڑے تو تم سب کے سپہ سالار ابوعبیدہؓ بن الجراح ہوں گے۔حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ اور حضرت شرجیل بن حسنہؓ کی فوجوں کی روانگی کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے سات ہزار مجاہدین کے ساتھ معرقہ کے راستے حمص کا رُخ کیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ ''ثنیۃ الوداع'' تک ان کی مشایعت کیلئے تشریف لے گئے جب وہ چلنے لگے تو صدیق اکبرؓ نے انہیں بدیں الفاظ وصیت کی۔

''ابوعبیدہؓ اچھے عمل کرنا، مجاہد بن کر رہنا، شہید کی موت مرنا، اللہ تعالیٰ تمہارا اعمال نامہ تمہارے دائیں ہاتھ میں دے اور دنیا و آخرت میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، خدا کی قسم مجھے اُمید ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو اللہ سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں جو دنیا سے مطلق کوئی لگاؤ نہیں رکھتے، جو آخرت کے طالب ہیں، اللہ نے تم پر بڑا فضل کیا ہے کہ تم مسلمانوں کی فوج لے کر اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرنے جا رہے ہو، لہٰذا جو لوگ اللہ کے منکر ہیں، اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں، جھوٹے خداؤں کو پوجتے ہیں، ان سب سے جہاد کرنا''۔

حضرت ابوعبیدہؓ شام میں داخل ہوئے تو انہوں نے کیل کانٹے سے لیس رومیوں کے بڑے بڑے جمگھٹوں کو ہر جگہ جنگ کیلئے تیار پایا۔ان کے مقابلے میں حضرت ابوعبیدہؓ کی جمعیت آٹے میں نمک کے برابر تھی تاہم حضرت ابوعبیدہؓ اِسی مختصر لشکر کے ساتھ بُصریٰ اور مآب کو تسخیر کرتے ہوئے جابیہ پہنچ گئے اور وہاں سے ہرقل کی زبردست جنگی تیاریوں کا حال خلافت میں لکھ

بھیجا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کا خط ملتے ہی ایک طرف تو مدینہ منورہ سے امدادی افواج روانہ کر دیں اور دوسری طرف حضرت خالدؓ بن ولید کو جو عراق میں ایرانیوں کے خلاف مصروف جہاد تھے، حکم بھیجا کہ تم اپنے لشکر کو لے کر عراق سے شام پہنچ جاؤ۔ ساتھ ہی حضرت یزید بن ابی سفیانؓ، حضرت شُرجیل بن حسنہؓ حضرت عمروؓ بن العاص کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی اپنی فوجیں لے کر حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پہنچ جائیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس امدادی افواج پہنچ گئیں اور حضرت خالدؓ بن ولید بھی ان سے آن ملے تو انہوں نے سب سے پہلے اجنادین کا رُخ کیا جہاں رومیوں کا ایک زبردست لشکر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ کو اجنادین کے قریب فریقین کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا۔ رومیوں نے پرزور مزاحمت کی لیکن مسلمانوں کے جوشِ ایمان کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ میدانِ جنگ میں اپنے تین ہزار آدمی کٹوا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے رومیوں کا تعاقب کیا تو راستے میں انہیں ایک تنگ گھاٹی ملی جس میں سے صرف ایک ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ جو مسلمان اس مقام سے پار ہو گئے ان سے رومی لڑنے لگے۔ مجاہدین میں حضرت عمروؓ بن العاص کے بھائی حضرت ہشامؓ بن العاص بھی تھے۔ وہ سابقون الاولون میں سے تھے اور دو ہجرتوں سے ممتاز تھے۔ جونہی اس تنگ گھاٹی سے گزرنے لگے ایک رومی کے تیر سے شہید ہو کر گر گئے۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچتا تھا، حضرت ہشامؓ کی لاش پر گھوڑا لے جانا گوارا نہ کرتا تھا اور وہیں رُک جاتا تھا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے مسلمانوں کو للکار کر کہا:۔

''مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی کو رُتبۂ شہادت پر فائز کیا اور اس کی روح کو اُٹھا لیا۔ یہاں تو اب صرف اس کا جسم ہے اس لئے تم لوگ ان کی لاش پر سے گھوڑے لے جاؤ اور گھاٹی کے پار مسلمانوں کی مدد کو پہنچو''۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا گھوڑا بڑھایا ساتھ ہی دوسرے لوگ بھی چل پڑے۔ حضرت ہشامؓ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن مسلمانوں نے رومی بھگوڑوں کے بھی پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے۔ اختتامِ جنگ پر حضرت ہشامؓ کی لاش کے ٹکڑوں کو بورے میں بھر کر سپردِ خاک کیا گیا۔

معرکہ اجنادین کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابوعبیدہؓ نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔

دمشق کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی اور حضرت عمر فاروقؓ مسند نشین خلافت ہوئے ۔عہد فاروقی کے اوائل ہی میں ایک دن حضرت خالدؓ بن ولید فصیل پھاند گئے اور شہر کے دروازے کھول دیئے ۔حضرت ابوعبیدہؓ اپنی فوج کے ساتھ تیار کھڑے تھے وہ فوراً شہر کے اندر داخل ہو گئے ۔اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے اور حضرت ابوعبیدہؓ کا سامنا ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو بتایا کہ میں نے اہل شہر کو امان دے دی ہے اس لئے تم بھی اپنا ہاتھ روک لو۔حضرت خالدؓ نے اسی وقت تلوار نیام میں ڈال لی ۔حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کے مفتوحہ حصہ شہر کو بھی معاہدہ صلح میں شامل کرلیا اور دمشق پر پرچم اسلام بلند کر دیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی (۱۳ھ میں) حضرت خالدؓ بن ولید کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا۔اور ان کہ جگہ حضرت ابوعبیدہؓ کو شام کا سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا۔لیکن علامہ شبلی نعمانیؒ اور کچھ دوسرے مورخین اس طرف گئے ہیں کہ حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی ۱۷ھ میں ہوئی ۔فریقین کے اپنے مآخذ اور دلائل ہیں۔اصل میں نہ صرف حضرت خالدؓ بن ولید کے سال عزل بلکہ اس دور کی بہت سی مشہور جنگوں کے سالِ وقوع کے بارے میں بھی مورخین میں سخت اختلاف ہے ۔یہ دورِ حاضر کے مورخین کی اپنی صوابدید اور تحقیق پر منحصر ہے کہ وہ کونسی روایات کو ترجیح دیتے ہیں ۔قطع نظر اس کے کہ شام کے معرکوں میں حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید کی اصل حیثیت کیا تھی، حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے شام کے تمام معرکے باہمی تعاون واشتراک سے سر کیے اور دونوں ہی اپنی شجاعت، جوانمردی،تدبیر وحکمت اور قائدانہ صلاحیتوں کیلئے سزاوارِ تحسین ہیں ۔(جاری ہے)

علامہ اقبالؒ۔ پیدائش، بچپن، جوانی

''سرگزشت اقبال'' سے اقتباسات

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

خاندان

''میں نے دیکھا، ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ پروں والا پرندہ اُڑ رہا ہے۔ اس کی دلکشی اور دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوان وار اپنے بازو اُٹھا اُٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اُترا، اور میری گود میں آن گرا''۔

یہ تھا وہ خواب جو حضرت علامہ کے والد شیخ نور محمد نے ان کی ولادت سے پہلے دیکھا اور اس کی تعبیر خود ہی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمت اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔

حضرت علامہ نے اپنے پاک نفس والد کے روحانی مزاج کے بارے میں احباب سے ایک واقعہ یوں بیان کیا کہ جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، آدھی رات کو سوتے میں ایک شور سا سن کر چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو ادھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور مجھے سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تا کہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رویا سنا رہے تھے، جو رات انہوں نے بہ حالت بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کیلئے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگہ منگایا، مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے۔ چند گھنٹوں میں تانگہ اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں کارواں کا ڈیرہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت منداور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے کیلئے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگے سے اُترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو

والد نے کہا، مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے۔ مگر وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے اور اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہو گی۔ اس وقت نہ مجھے یقین آیا، نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی۔ لیکن چوبیس گھنٹے ہی گزرے تھی کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔

روحانیت اس خاندان کی گھٹی میں تھی اور آباء اجداد سے چلی آتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اِس کا تذکرہ کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے آغاز پر روشنی ڈالیں۔ یہ کشمیری خاندان اصلاً برہمن تھا۔ اس خاندان نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں اسلام قبول کیا۔ اس کی گوت سپرو تھی جس کی وجہ تسمیہ اقبال نے اپنے والد مرحوم کے حوالے سے یوں بیان کی:۔

''جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو برہمن، کشمیری مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف قدامت پرستی یا کسی اور وجہ کے باعث توجہ نہ کرتے تھے۔ اس لئے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومت اسلامیہ کا اعتماد حاصل کیا، وہ سپرو کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں، وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کر دے۔ 'س' تقدم کیلئے کئی زبانوں میں آتا ہے۔ اور 'پر' کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر 'پڑھنا' کا ہے۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے ان بھائی بندوں کو از راہ تعریض و تحقیر دیا تھا جنہوں نے قدیم رسوم و تعصبات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان اور علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا، جو رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا''۔

اقبال کے جد اعلیٰ حضرت بابا لولی حج، تھے۔ اس سلسلے میں اقبال نے 5۔ اکتوبر 1925ء کو

اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے نام ایک مکتوب کے دوران میں لکھا: ''آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔حضرت بابا لولی حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ان کا ذکر خواجہ اعظم کی ''تاریخ کشمیر'' میں اتفاقاً مل گیا ہے۔والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا، وہ بحیثیت مجموعی درست ہے۔ان کا اصل گاؤں لوچر نہیں تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ آدون تھا۔بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے، اس واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین کے مرید ہوئے جو حضرت نور الدین ولی کے مرید تھے۔بقیہ عمر اُنہوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں''۔

حضرت بابا نے لولی حج کا لقب پایا جس کا مطلب ہے ''عاشق حج''۔لقب ملنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کئی مرتبہ پیدل جا کر حج کیا۔ان کا مدفن موضع چرار شریف میں ہے جو سری نگر کے جنوب مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔اقبال نے یہ تو بتایا ہے کہ حضرت بابا ان کے جد اعلیٰ تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان سے کس پشت میں اقبال کا رشتہ منسلک ہوتا ہے۔سلسلہ نسب کی درمیانی کڑیاں گم ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت بابا کی اولاد میں سے سب سے پہلے کون سیالکوٹ میں آ کر آباد ہوا۔اور کب؟اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت علامہ کا بیان ملاحظہ ہو۔

''ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے۔ان کا نام تھا شیخ اکبر۔انہیں پیری اس طرح ملی کہ سن کھترا میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے اور اس لئے ان پر ہمیشہ طعن و تشنیع ہوا کرتی تھی۔اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے، جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسینؓ کی یادگار ہے۔اس کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔مخالفوں نے یہ دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقع سید ہیں۔ان کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔

سن کھترا سیالکوٹ کا ایک گاؤں ہے۔اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے شیخ اکبر ہی نے ترک وطن کیا اور سیالکوٹ میں مقیم ہوئے۔

دوسری تاویل فقیر سید وحید الدین کی ہے جو ملفوظات و نوادر کی بنا پر علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے منسوب کی گئی ہے۔ملاحظہ فرمائیے:

''قرآئن یہ ہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہوگی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال دین تھے یا ان کے چار بیٹے جن کے نام شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ تھے۔اس کا بھی امکان ہے کہ شیخ جمال دین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترک وطن کیا ہو۔بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے''۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ اکبر علامہ کے والد شیخ نور محمد کے دادا نہیں، پڑ دادا تھے اور چونکہ ترک وطن اٹھارویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا، اس لئے بعض سوانح نگاروں کا یہ اندازہ درست ہے کہ اس خاندان کے افراد نے 1857ء کے ہنگاموں کے بعد ترک وطن کیا۔

شیخ جمال دین کے فرزند شیخ محمد رفیق علامہ کے دادا تھے۔عام کشمیری رواج کے مطابق شیخ رفیقا کہلاتے تھے۔کشمیری دھسوں کی تجارت کرتے تھے اور علامہ کے بیان کے مطابق سکھوں کی فوج میں ملازم تھے اور وہ سکھوں کی طرف داری میں گجرات میں انگریزوں سے لڑے تھے۔یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ انکا پیشہ تجارت تھا یا سپہ گری۔بہر حال عین ممکن ہے کہ پہلے سپہ گری کرتے ہوں اور اس کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا ہو۔

شیخ محمد رفیق کے دو صاحبزادے تھے۔ایک شیخ نور محمد جو علامہ کے والد تھے دوسرے شیخ غلام محمد جو محکمہ انہار میں ملازم تھے۔شیخ نور محمد نہایت وجیہ و شکیل بزرگ تھے، رنگ سرخ، داڑھی سفید، لباس سادہ، چھڑی ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے۔نظر ہر وقت سامنے رکھتے تھے، اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے۔علماء و صلحاء کی صحبت میں رہتے۔غور و فکر کی عادت پائی تھی، تصوف میں خصوصی درک رکھتے تھے اور علم کا یہ عالم تھا کہ لوگ تصوف کی کتابوں میں بعض مطالب کے فہم سے عاجز ہوتے تو تشریح کیلئے ان کے پاس آتے تھے۔چونکہ رسمی تعلیم نہیں پائی تھی اور اس کے باوجود عالم تھے، اس لئے اہل علم انہیں ان پڑھ فلسفی کا خطاب دیتے تھے۔جب بھی اقبال کا کوئی نیا مجموعہ کلام شائع ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے اور جذب و معرفت کے مضامین، خاص طور سے مثنوی اسرار خودی پڑھ کر بے چین ہو جاتے یہاں تک کہ زار و قطار رونے لگے۔آخری عمر میں ان کی یہ کیفیت اور بھی زیادہ شدید ہوگئی تھی۔

شیخ نور محمد کی روحانیت کی ایک مثال پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ان سے وابستہ ایک اور واقعہ علامہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:۔

''میرے والد ایک روز گھر آرہے تھے۔ہاتھ میں رومال تھا،رومال میں تھوڑی سے مٹھائی۔ اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے۔اس کی یہ حالت دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی۔ مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پانی کی طلب ہے۔والد ماجد نے اسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا۔رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے،جس میں مٹھائی کے طبق کے طبق رکھے ہیں۔صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ اس نیک عمل کا ثمر تھا جو کل ان سے سرزد ہوا۔چنانچہ اس روز سے انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دن پھرنے والے ہیں''۔

جس خاندان کی خدمت شیخ اکبر نے کی تھی انہی دنوں اس خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا،آپ دھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے۔والد ماجد نے دو چار سو دھسے تیار کئے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں پر بک گئے،حالانکہ فی دھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی۔دو چار سو دھسے فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا۔بس یہی ابتدا تھی،ہمارے دن پھرنے کی۔

شیخ نور محمد کی رفیقۂ حیات محترمہ امام بی بی اگرچہ رسمی طور پر خواندہ نہیں تھیں،لیکن دینی اوامر و نواہی سے خوب باخبر تھیں۔اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ سیالکوٹ میں مقیم ایک نامور شخصیت ڈپٹی وزیر علی بلگرامی نے شیخ نور محمد کو اپنے ہاں کپڑے سینے پر ملازم رکھا تو محترمہ امام بی بی نے اس بنا پر اپنے شوہر کی تنخواہ کو ذاتی مصرف میں لانے سے انکار کر دیا کہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدن کا غالب حصہ شرعاً جائز نہیں تھا۔اس پر کچھ عرصہ بعد شیخ نور محمد نے نوکری چھوڑ دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔یہ ٹوپیاں خوبصورت بھی تھیں اور مضبوط بھی،اس لئے بہت جلد مقبول ہو گئیں اور کاروبار اتنا بڑھا کہ انہوں نے بہت سے درزی ملازم رکھ لئے۔ محترمہ امام بی بی کے بارے میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بڑی زیرک،معاملہ فہم اور مدبر خاتون

تھیں۔ برادری کے جھگڑوں کو خوش اسلوبی سے نمٹاتی تھیں۔غریب گھرانوں کی لڑکیوں کو پالتی تھیں، انہیں مناسب تربیت دے کر بیاہ دیتی تھیں۔ کئی غریب عورتوں کی خفیہ امداد کرتی تھیں اور محلے کی بعض عورتیں ان پر اتنا بھروسہ کرتی تھیں کہ اپنے زیورات اور نقدی ان کے پاس امانت رکھ جاتی تھیں۔

کسی نابغہ روزگار ہستی کے اُبھرنے میں بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکتساب علم وفن میں ریاض کو بہت دخل ہوتا ہے، لیکن خاندانی روایات ، ماحول اور تربیت بھی اثر ڈالتے ہیں۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے جد اعلیٰ ایک بہت بڑے بزرگ تھے، جنہوں نے صدق وصفا میں بڑا نام پیدا کیا۔اقبال کی والدہ صوفی منش اور دین دار بزرگ تھے۔ ان کی والدہ محترمہ دیانت وامانت،غریب پروری،اوامر ونواہی سے آگہی اور خدمت خلق کا مجسمہ تھیں۔اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو ماحول انہیں ملا، وہ کیا تھا؟ اس کیلئے ہمیں ان کے مولد سیالکوٹ کی تاریخ پر ایک مختصر سی نظر ڈالنی ہوگی۔سیالکوٹ پنجاب کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

پورن بھگت کی صوفیانہ داستان کا مرکز ہے۔دور مغلیہ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ،ریشم اور تلے کی کشیدہ کاری اور شامیانہ سازی کیلئے مشہور تھا۔اکبر کے عہد میں مولانا کمال نے علم پروری کی مثال قائم کی۔شاہ جہان کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹ کے مدرسۃ العلوم سے فیض حاصل کرنے کیلئے دور دراز مقامات سے تشنگان علم آتے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ان کے فرزند مولوی عبداللہ نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔علم پروری اس علاقے میں اس درجہ رچی بسی ہوئی تھی کہ الحاق پنجاب کے فوراًبعد سیالکوٹ کے 950 دیہات پر جو تعلیمی محصول عائد کیا گیا اس کی ادائیگی پیشگی ہوگئی اور تمام مجوزہ مدارس فوراًکھل گئے۔1857ء کے انقلاب سے پہلے لاہور کے مقابلے میں پنجاب میں کوئی صحافتی مرکز تھا تو سیالکوٹ، جہاں سے چند اخبار اور رسالے جاری ہوئے۔ظاہر ہے پڑھنے والے موجود تھےتو اخبار اور رسالے نکلے۔عمومی تعلیم کے پہلو بہ پہلو دینی تعلیم کے مراکز بھی قائم تھے۔انیسویں صدی کے اواخر میں مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کے بیان

کے مطابق سیالکوٹ کے مراکز درس و تدریس چار تھے۔ مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب، مولانا ابو عبداللہ غلام حسین کی درسگاہ، مولوی مزمل کا مدرسہ اور مولانا سید میر حسن کا مدرستہ العلوم۔ اول الذکر میں عربی اور فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علامہ کے والد ماجد شیخ نور محمد کی زیادہ رسم و راہ مولانا غلام حسین کے ساتھ تھی اور وہ انہی کے ہاں معارف دین کی سماعت کیلئے جایا کرتے تھے۔

اِس علم پرور ماحول میں شیخ نور محمد جیسی علم کی پیاسی شخصیت کے ہاں دو لڑکے ہوئے۔ ایک شیخ عطا محمد، جو 1859ء میں پیدا ہوئے اور 1940ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ دوسرے حضرت علامہ جو 3 ذیقعد 1294 ہجری مطابق 9 نومبر 1877ء کو عالم وجود میں آئے اور وہ خواب پورا ہوا کہ ''سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اترا اور میری گود میں آن گرا''۔

سیالکوٹ کا سب سے پرانا بازار ''بازار چوڑی گراں'' کے نام سے مشہور تھا۔ اب اسے اقبال سٹریٹ کہتے ہیں۔ اقبال منزل یہیں واقع ہے۔ اس میں پندرہ کمرے اور سات دکانیں شامل ہیں۔ گلی کی جانب اس کے پچھلے حصے میں اقبال پیدا ہوئے۔ ''اِس زمانے میں یہ ایک منزلہ، کچھ کچا اور کچھ پکا، پرانے فیشن کا مکان تھا جس میں گلی کی طرف ایک ڈیوڑھی، دو کوٹھڑیاں، ان کے ساتھ ایک دالان اور اس کے آگے چھوٹا سا صحن تھا''۔ اِسی چھوٹے سے مکان میں اقبال نے بچپن گزارا اور شباب کی منزل میں قدم رکھا۔

پانچ چھ برس کے ہوئے تو انہیں ایک مکتب میں داخل کرایا گیا۔ یہ مکتب محلّہ شوالہ کی مسجد کے خطیب و امام مولوی غلام حسین نے جاری کر رکھا تھا۔ ایک دن سیالکوٹ کے نامی گرامی عالم دین مولوی میر حسن شاہ مولوی غلام حسین سے ملنے آئے جو اس وقت بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ مولوی میر حسن کی نظر اقبال پر پڑی تو پوچھا، کس کا بچہ ہے، اس کا کیا نام ہے؟ جواب ملا، شیخ نور محمد کا لڑکا محمد اقبال ہے۔ ایک دو دن بعد مولوی میر حسن کی ملاقات شیخ نور محمد سے ہوئی۔ انہوں نے شیخ صاحب سے کہا، آپ اپنے لڑکے کو شوالہ کے مکتب میں پڑھنے کیلئے بھیجتے ہیں اب اسے میرے پاس بھیجیں، میں اسے پڑھاؤں گا۔ شیخ نور محمد مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اقبال کو شوالہ کے مکتب سے اُٹھایا اور مولوی میر حسن کے مکتب میں

داخل کرادیا۔

یہ مولانا میر حسن وہ استاد تھے جنہوں نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنایا۔وہ عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ ادبیات،لسانیات، ریاضیات اور تفسیر قرآن کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔سالک رقم طراز ہیں"حضرت شاہ صاحب نے کچھ شیخ نور محمد کی دوستی کی وجہ سے اور کچھ اقبال کی طباعی اور ہونہاری کے باعث ان کی تعلیم وتدریس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ۔اس زمانے کا عام معمول یہ تھا کہ اس قسم کے معلمین بچوں کو گلستان، بوستان، سکندرنامہ، یوسف زلیخا، جامی، صرف بہائی، صرف میر، ہدایۃ النحو، کافیہ، کنزالدقائق، قدوری وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔شاہ صاحب کے ہاں بھی یہی قاعدہ تھا لیکن ان کے اسلوب تدریس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض رٹانے پر اکتفانہ کرتے تھے، بلکہ اپنے طلبہ میں فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کرتے تھے۔اکثر ایسا ہوتا کہ وقت تک سمجھاتے رہتے، جب تک اس کا مطلب پوری طرح طالب علم کے ذہن نشین نہ ہوجاتا انہیں عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ موقع پر انہیں برمحل اشعار فوراً یاد آجاتے ۔اس میں کسی تکلف وتردد کی ضرورت نہ پڑتی ۔ کچھ مدت تک اقبال صرف شاہ صاحب سے پڑھتے رہے ۔آخر شاہ صاحب ہی نے ان کو سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل کرا دیا جس میں وہ خود مدرس مقرر ہو گئے تھے۔اس کے بعد معمول یہ ہو گیا کہ اقبال مدرسے میں تو عام کورس پڑھتے لیکن وہاں سے واپس آ کر انہی تدریسات میں مصروف ہوجاتے جو شاہ صاحب نے شروع کرا رکھی تھیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک نہایت باقاعدگی سے جاری رہا جب وہ سکاچ مشن کالج سے ایف اے پاس کر کے مزید تعلیم کیلئے لاہور چلے آئے ۔چونکہ شاہ صاحب نے سال ہا سال تک اقبال کو عربی، فارسی، علم وحکمت، ادبیات، تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کو صحیح راستے پر لگا دیا تھا اور ان میں علوم قدیمہ واسلامیہ کیلئے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی تھی، اس لئے اقبال جب کبھی موقع پاتے ، سیالکوٹ آ کر شاہ صاحب سے اپنے شکوک رفع کراتے، مزید سبق لیتے اور غوامض علوم پر اپنے استاد کی ہدایت و رہنمائی سے غور وفکر کرتے ۔

اقبال میں حصول علم کیلئے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ رات کو نیند میں اُٹھ اُٹھ کر پڑھتے رہتے ۔ایک دفعہ نصف شب کے وقت والدہ اقبال کی اچانک آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہیں کہ اقبال دیے کے قریب بیٹھے سکول کا کام کر رہے ہیں ۔خالد نظیر صوفی، اقبال کی بڑی بھابھی بیگم شیخ عطا محمد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اقبال کی والدہ نے ''دو ایک آوازیں دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے؟ انہوں نے اُٹھ کر شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا، اقبال! اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو، اُٹھو سو جاؤ۔ صبح کام کر لینا۔(اقبال) کسمسائے اور جواب دیا، بے جی! سویا ہوا تو ہوں۔اب تو ان کی والدہ کو وہم ہو گیا۔روز رات کو کئی کئی بار اُٹھ کر دیکھتیں اور اکثر انہیں اس حالت میں پاتیں اور اُٹھا کر سلاتیں۔صبح کو جب آپ سے اس کے متعلق استفسار کیا جاتا تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے۔حیران کن بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ نیند میں حل کرتے، وہ بالکل درست ہوتے۔آہستہ آہستہ ماں کی توجہ سے ان کی یہ عادت چھوٹ گئی''۔

اقبال کے ایک ہم جماعت سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ ''جن دنوں سکاچ مشن سکول کی چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے، ایک روز ان کی جماعت میں ایک مرد قلندر راوِ نچے، لمبے اور سرخ و سپید، اپنے حال میں مست آن وارد ہوئے۔بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا، پیشانی کو بوسہ دیا اور بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔اُستاد نے آپ سے ان کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مرد درویش نے کسی سے بھی ان کے متعلق دریافت نہیں کیا تھا اور خود ہی سیدھے ان کے پاس جا پہنچے تھے''۔

شعر کا ذوق بھی بچپن میں شروع ہو گیا۔شیخ عطا محمد کی اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی۔بارہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت ازار بند بُنا کرتی تھی اور اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ہمیں اس لحن سے سنایا کرتے تھے۔ان کی آواز بہت شیریں تھیں۔اکثر اوقات قصہ سناتے سناتے اپنی طرف سے بھی کوئی مصرع اس میں جڑ دیتے ہیں اور ان کا مصرع ایسا پراثر اور خوبصورت ہوتا کہ ہم سب انہیں بے ساختہ داد دیا کرتیں۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل دس بارہ برس تھی۔

1891ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور 1893ء میں انٹرنس کا۔ انٹرنس کا امتحان سیالکوٹ میں نہیں دیا کیونکہ وہاں امتحان کا سنٹر نہیں تھا، اس لئے گجرات کے سنٹر میں امتحان دیا۔ امتحان کے دوران میں گجرات کے ایک دولتمند بزرگ ڈاکٹر عطا محمد خان نے انہیں دیکھا تو پسند فرمایا اور اپنی بڑی بیٹی کیلئے رشتہ چاہا۔ گفتگو کے بعد رشتہ طے پا گیا۔ اقبال نہیں چاہتے تھے کہ کمسنی میں شادی کرلیں۔ لیکن بزرگوں کا حکم بھی نہیں ٹال سکتے تھے، اس لئے مان گئے، جب برات سیالکوٹ سے گجرات جانے کیلئے تیار ہوئی، سہرا بندھ گیا، اقبال گھوڑے پر سوار ہو گئے تو امتحان میں کامیابی کا تار آیا۔ اس اہلیہ سے دو بچے ہوئے۔ لڑکی کا نام معراج بیگم تھا اور لڑکے کا آفتاب اقبال۔ معراج بیگم اٹھارہ سال کی عمر میں فوت ہو گئیں، آفتاب اقبال نے اعلیٰ تعلیم پائی اور بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ ویسے یہ شادی کامیاب نہ رہی۔ فریقین ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے اور یہ کھچاؤ آخری دم تک رہا۔

انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد سکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے۔ اس کالج کی تاسیس 1888ء میں ہو چکی تھی۔ اقبال کی تعلیم کے زمانے میں یہ کالج گورنمنٹ سکول کی عمارت میں واقع تھا اور کالج کا تدریسی عملہ پانچ افراد پر مشتمل تھا جن کے نام یہ ہیں: جان ڈبلیو ینگسن ڈی (پرنسپل)، نرنجن داس، بی۔اے، پنڈت تیرتھ رام اور مولوی میر حسن شاہ۔ اس زمانے میں کالج میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ انگریزی، فلسفہ، ریاضی، سائنس، عربی، فارسی اور سنسکرت۔ اقبال نے انگریزی کے علاوہ کون کون سے مضامین لئے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ کالج کے زمانے میں اقبال کیسے طالب علم تھے؟ اس سلسلے میں کوئی دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں البتہ دو شواہد ان کی ذہانت اور قابلیت کے غماز ہیں۔ اول یہ کہ انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ وظیفہ بھی حاصل کیا اور تمغہ بھی۔ ظاہر ہے یہی رنگ ایف اے میں رہا ہو گا۔ دوم یہ کہ اقبال کی جو درسی کتابیں محفوظ ہیں ان پر جابجا تشریحی نوٹ ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے موجود ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ شدید محنت کے عادی تھے۔ (جاری ہے)

بشکریہ نوائے وقت!

(ہمیں خدا کیسے ملا؟)

فاطمہ۔۔۔ سیاہ ہیرا

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

امریکہ کی ایک سیاہ فام نومسلم خاتون کے حوالے سے ایک ایمان افروز کہانی ۔ اسے حنا خیری نے تحریر کیا۔ یہ اُردو ڈائجسٹ کے شمارہ جنوری ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی۔

ناشا سے میری ملاقات پارٹی میں ہوئی۔ جم نے دفتر کے سب ساتھیوں کو بلا رکھا تھا۔ سب لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میز پر خورد و نوش کی چیزیں رکھی تھیں۔۔۔ سلاد، کٹی ہوئی سبزیاں جیسے گاجر، بند گوبھی، کھیرا، مولی، ٹماٹر، پنیر کے ٹکڑے، کریکرز، کیک، بسکٹ، چکن ونگز اور سوفٹ ڈرنک وغیرہ۔ میں نے پکوڑے بنائے تھے جو سب لوگ بڑے شوق سے کھا رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں چیزیں رکھیں اور ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگا۔

''ہائے رمیز! کیا حال چال ہے؟ کیا تم میری دوست سے ملے ہو؟'' کھترین نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے ساتھ ایک افریقن امریکن لڑکی تھی جو حجاب باندھے تھی۔

''نہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''یہ ناشا ہے اور یہ جم کا روم میٹ۔ اب تم دونوں بیٹھ کر ایک دوسرے سے متعارف ہو۔ میں ابھی آتی ہوں''۔

''آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟'' ناشا نے پوچھا۔

''پاکستان سے'' میں نے جواب دیا۔

''واہ!'' وہ بولی ''مسلم؟''۔

''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''میں بھی مسلم ہوں۔'' اس نے گرمجوشی سے کہا۔ یہ تو میں اس کے حجاب کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ بھی مسلمان ہے۔ اس کے بعد باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

پہلی ملاقات ہی میں ناشا نے اچھا تعارف چھوڑا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت کی لڑکی دکھائی دی۔ میں کچھ عرصے سے اپنی پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ میں قیام پذیر تھا اور ساتھ ہی چھوٹی موٹی نوکری بھی کر رہا تھا۔ میں جم کے ساتھ رہ رہا تھا اور اس کے ساتھیوں، دوستوں سے واقف

تھا۔ جم اور اس کے ساتھی اکثر مجھے کسی نہ کسی کے ساتھ ملوث کرانے کے چکر میں رہتے لیکن میں ان سے کہتا "مجھے معاف رکھو۔ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ دوستیاں اور عشق پالنے نہیں"۔ ویسے بھی میں جس محبت پر یقین رکھتا تھا وہ شادی کے بعد کی محبت تھی۔ میرے برعکس بہت سے لڑکے ایسے تھے جو ایک وقت میں کئی کئی لڑکیوں سے دوستیاں رکھتے تھے۔ ان میں اکثریت ایسے لڑکوں کی تھی جو امیر والدین کے بیٹے تھے جو ماں باپ کے خرچ پر تعلیم حاصل کر رہے تھے اور خوب گل چھرّے اڑا رہے تھے۔ وہ بھلا سنجیدہ ہو کر کیا پڑھتے۔

کئی لڑکیوں نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ کسی نے براہ راست اور کسی نے دیگر ذریعے سے، لیکن میں صاف کنی کترا گیا۔ جو لڑکیاں میرے ساتھ پڑھتی یا کام کرتی تھیں یا کسی کے وسیلے سے میں انہیں جانتا تھا، ان سے میری سلام دُعا تو تھی اور کام کی بات بھی ہوتی، لیکن کسی کو میں نے اپنی ذاتی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ اکثر لوگوں کی خواہش کے باوجود کسی کو ڈیٹ پر لے گیا نہ کسی کے ساتھ لنچ، ڈنر کیا۔ گورے تو گورے دیسی لوگ بھی میرے پیچھے پڑے رہتے کہ میں یہاں کسی سے شادی کرلوں۔ ان میں وقار بھائی اور شمع بھابی سرفہرست تھے۔ وقار بھائی بہت عرصے سے یہاں آباد تھے۔ ان کے دو بچے تھے۔ اکثر و بیشتر ان سے ملاقات رہتی۔ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ عید بقر عید کے علاوہ اکثر ان کے ہاں دعوتیں ہوتی رہتیں جن میں میں بھی مدعو ہوتا۔ ان کے کئی ملنے والوں کے ہاں شادی کے لائق لڑکیاں تھیں جو کچھ پڑھتی اور کچھ جاب کرتی تھیں۔ اکثر موضوع ہر پھیر کے میری شادی پر آن کے ٹھہر جاتا۔

"اب تمہارا ماسٹرز ختم ہونے کو ہے۔ اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کرلو"۔ وقار بھائی کہتے!

"ہاں ۔۔۔۔ میری نظر میں کئی لڑکیاں ہیں۔ تم کسی ایک کا نام لو، باقی کام میرے ذمے"۔ شمع بھابھی کہتیں۔

"مجھے تو ابھی معاف ہی رکھیں"۔ میں زیر لب مسکراتا۔ "ابھی میرا اِس جھنجھٹ میں پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور پھر یہاں کی لڑکیاں خاصی ایڈوانس بھی ہوتی ہیں، مرد کو پاؤں کی جوتی سمجھتی ہیں اور یہ کہ ان سے شادی کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ کیلئے یہیں ٹک جاؤ۔ آسائشوں میں پلی بڑھی کہاں پاکستان جاکے رہنا پسند کرتی ہیں"۔

"ارے تم ہاں تو کرو، پھر دیکھو۔ سب ایک سے نہیں ہوتے"۔ بھابی کہتیں۔

''ہاں''۔وقار بھائی بولتے۔''اب تم خود ہی سوچو،سٹوڈنٹ ہو،لیکن تمہارے پاس گاڑی ہے۔یہاں ایک ہزار ڈالر میں ایسی گاڑی مل جاتی ہے جو وہاں لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے میں ملے۔ اب بتاؤ''۔

''ہاں یہ تو ہے۔۔۔۔''میں کہنے کی کوشش کرتا۔

''ارے میاں، وہاں دھرا کیا ہے؟''وہ کہتے۔

''یہاں شاہانہ طرزِ رہائش اور تمام تر سہولیات میسر ہیں، کتنے مزے کی زندگی ہے اور وہاں جوتے گھس جاتے ہیں نوکری تلاش کرتے کرتے۔نوکری مل جائے تو ساری عمر گھر بنانے کے خواب دیکھتے گزر جاتی ہے''۔

''مگر یہاں بھی یہ سب کچھ آسانی سے حاصل تو نہیں ہوتا۔کریڈٹ کارڈز کے طفیل سب سہولیات میسر ہو جائیں تو بھی تمام عمر قرضے اُتارتے گزرتی ہے''۔

''اُتر جاتے ہیں قرضے بھی''۔وہ کہتے''کسی چیز کیلئے ترسنا تو نہیں پڑتا''۔بحث طول پکڑتے دیکھ کر میں خاموشی سادھ لیتا۔

میں نے ایم کرلیا تو کسی ڈھنگ کی جاب کی تلاش میں لگ گیا۔میرا ارادہ ڈبل ماسٹرز کرنے کا تھا۔اس کا شوق مجھے ہمیشہ ہی سے تھا۔میں کسی جز وقتی کام کی تلاش میں تھا۔جم کے ذریعے کیتھرین نے کہلوایا کہ ناشا کے دفتر میں کچھ آسامیوں کی گنجائش ہے، میں آزما کے دیکھوں۔ ناشا سے ملاقات ہوئے کوئی چھ آٹھ مہینے ہو گئے تھے۔میں اس کے دفتر پہنچا اور ایک جاب کیلئے درخواست دی۔ناشا اِسی دفتر کے دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔کوشش کرنے سے مجھے یہ ملازمت مل گئی جو اس لحاظ سے اچھی تھی کہ میں اور کوئی چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے سے بچ گیا۔یہاں ترقی کا موقع بھی تھا اور صرف آدھے دن کی جاب تھی۔باقی وقت میں اپنے ماسٹرز میں لگا رہتا۔یہ سلجھی ہوئی طبیعت کی لڑکی مجھے گوارا لگتی۔یاد رہے امریکہ میں کالے اپنے آپ کو افریقی امریکی کہلاتے ہیں۔

دوسری کالی لڑکیوں کے برعکس ناشا میں ایک ٹھہراؤ اور وقار تھا۔وہ دوسرے کالوں کی طرح چیخ چیخ کر باتیں کرتی نہ منہ پھاڑ کر بدتمیزی سے ہنستی۔جان پہچان کو کچھ عرصہ گزرا تو اس کی شخصیت کے بعض اور پہلو میرے سامنے اُجاگر ہوئے۔اسے بہت سے امریکی سماجی و اخلاقی

پہلوؤں سے اختلاف تھا۔اس کی نظر میں فیملی کی بڑی اہمیت تھی۔وہ مشترکہ خاندانی نظام کی قائل تھی، جبکہ عام افریقی و امریکی آزاد پنچھی کی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ناشا کی بہت سی خوبیوں کا میں معترف ہوتا جا رہا تھا۔اس کا تعلق ''نیشن آف اسلام'' سے تھا جو امریکی کالوں کی ایک سیاسی تنظیم ہے۔جسے مذہب کا لبادہ اوڑھا کر کالوں کو ایک پلیٹ فارم پہ مجتمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ مسلمان بھی اس جماعت کی تعلیمات اور پروپیگنڈے سے متاثر ہو کے ہوئی تھی۔ میں عام طور پر مذہب پر بات نہیں کرتا لیکن اس روز بات چل نکلی۔ہم سب کولیگ لنچ بریک میں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔دہشت گردی اور اس حوالے سے ایک دم اسلام کا ذکر نکل آیا۔چند لمحے تو میں خاموشی سے لوگوں کی مختلف آراء اور ان کے خیالات سنتا رہا جو کچھ اس طرح کے تھے کہ مسلمان اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے دہشت گردی کا سہارا لیتے ہیں۔آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے ایک چھوٹی دھواں دھار تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ دہشت گردی اور اسلام بالکل متضاد چیزیں ہیں۔یہ پروپیگنڈہ مغربی اور امریکی میڈیا کا پھیلایا ہوا ہے جس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔اسلام دنیا میں سب سے زیادہ امن و آشتی والا مذہب ہے جو ہر قسم کی دہشت گردی کی بھرپور مذمت کرتا ہے اور اگر کوئی بھی شخص دہشت گردی کی راہ اپنا لے تو وہ اس کا ذاتی فعل ہو گا نا کہ اسلام کا تقاضا۔لگے ہاتھوں میں نے انہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متعارف کرایا۔اس دوران سب خاموشی سے میری باتیں سن رہے تھے۔ناشا خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کر رہی تھی۔

بریک ختم ہوا اور سب اُٹھ کر جانے لگے تو ناشا مجھ سے مخاطب ہوئی ''رمیز! تمہاری باتیں مجھے بہت اچھی لگی ہیں اور نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے تمہاری گفتگو سنے جاؤں۔اس کائنات، زندگی اور جزا و سزا کے بارے میں میرے نظریات اتنے پیچیدہ ہیں، بہت سی چیزیں اُلجھی ہوئی ڈور کی طرح ہیں جنہیں سلجھانے کی کوشش کرتی ہوں اور اُلجھتی چلی جاتی ہیں۔مجھے نہیں معلوم کس ڈور، کس تار کو منتخب کروں، کون سی ڈور اُلجھے ہوئے معمے حل کر دے گی۔تمہارا مذہب ان سب چیزوں کے بارے میں کیا کہتا ہے؟''

میں نے کہا میں تمہیں کچھ کتابیں لا دوں گا۔تمہیں اپنے تمام سوالات اور اُلجھنوں کا جواب ان سے مل جائے گا۔

اگلے ہی دن میں نے اسلام اور سیرت پر کچھ کتابیں جو انگریزی میں تھیں، اِسے پڑھنے کو دیں۔ وہ کتابیں اس نے دو ڈھائی ہفتے ہی میں ختم کر لیں اور کہنے لگی "میرے اندر کا ہیجان بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے اور مجھ پر ایک نئی دنیا کے اسرار کھل رہے ہیں۔ کیا تم مجھے قرآن پڑھنے کو دو گے؟"۔

"بسر و چشم۔۔۔"، مجھے کیا چاہیئے تھا۔ میں تو چاہتا یہی تھا کہ وہ اصل اور نقل کا فرق دیکھ لے، وہ جان لے کہ اب تک کس جھوٹے ایمان کو اسلام سمجھ کر قبول کیے بیٹھی ہوئی ہے اور یہ کہ "نیشن آف اسلام" کہنے کو بے شک اسلام کا نام اختیار کیے ہوئے ہے لیکن درحقیقت اسلام سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک فتنہ ہے۔ جو مذہب عالیجاہ محمد کو نبی یا خدا کا پیغام رساں اور نجات دہندہ سمجھے اور اس کی بنیادی تعلیمات ہی اسلام سے بالکل مختلف ہوں، وہ فتنہ نہیں تو اور کیا ہے؟

اِس عرصے میں ناشا کی شخصیت میں عجیب سا تغیر پیدا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ تر وقت کھوئی کھوئی اور چپ چپ سی رہتی۔ پھر ایک روز چھٹی کے بعد جب تقریباً سب لوگ جا چکے تھے اور میں کام سمیٹ کر اُٹھنے ہی والا تھا کہ وہ میرے کمرے میں آ کر مخاطب ہوئی "رمیز! میں تم سے ایک بہت اہم بات کرنا چاہتی ہوں"۔

"ہاں کہو"۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔

"میں نے تمہاری دی ہوئی کتابوں کا اور قرآن کا مطالعہ کیا ہے"۔ وہ بولی "اور میرے ذہن پر چھائے ہوئے شکوک و شبہات اور وسوسوں کے بادل چھٹ چکے ہیں۔ ان کتابوں، خصوصاً اللہ کی کتاب نے میری آنکھوں پر سے ظلمت کا دبیز پردہ اُٹھا دیا ہے اور میں جان گئی ہوں کہ اب تک کس تاریکی میں پڑی تھی۔ عیسائیت سے نکل کر نیشن آف اسلام کے نام نہاد اسلام میں پھنسی تو اسے نجات دہندہ سمجھی، حالانکہ وہ ایک فتنہ ہے۔ اب جب کہ میں اسلام کا، جو اللہ کا پسندیدہ ترین اور تمام انبیاء کا مذہب ہے، مطالعہ کر چکی ہوں، بلا شک و شبہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے اور یہ کسی انسان کا کارنامہ ہو ہی نہیں سکتا اور یہ کہ اسلام دنیا کا سچا ترین مذہب ہے، جس میں کہیں کوئی ملاوٹ نہیں اور وہ میرے ذہن میں اُبھرنے والے تمام شکوک و شبہات اور کلفتوں کو مٹا چکا ہے۔ اب ایک ہی تمنا ہے کہ میں جلد از جلد کلمہ پڑھ کر اس کے دائرے میں داخل ہو

جاؤں''۔

اِس کی بات سن کر مجھے اس قدر مسرت ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ناشا اور میں اس عرصے میں ایک دوسرے کے خاصے قریب آ چکے تھے۔ میں مسلمان ہونے کے ناتے یہ تو خواہش کر سکتا تھا کہ ایک غیر مسلم دائرہ ایمان میں داخل ہو جائے لیکن اتنی جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ جائے گی اس کا مجھے شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی اس ماہیت قلب میں بمشکل چھ سات مہینے لگے ہوں گے۔

میں ناشا کو مولوی بشیر احمد کے پاس لے گیا جو ہمارے شہر کی ایک چھوٹی سی مسجد اور اسلامک سنٹر میں نماز جمعہ کی امامت کرتے تھے۔ ناشا نے ان کے ہاتھ پر کلمہ پڑھا اور اس کا اسلامی نام فاطمہ رکھا گیا۔ ہمارے دفتر کے کچھ لوگوں نے فاطمہ کے مسلمان ہونے سے لاتعلقی ظاہر کی اور کچھ نے تعجب و تاسف کا اظہار کیا۔ اس کے اپنے اقارب نے بھی یہ بات پسند نہ کی۔ فاطمہ اور میں ایک دوسرے کے خاصے قریب تو پہلے ہی آ چکے تھے مگر اسلام لانے کے بعد میں ایک عجیب سا بندھن اپنے اور اس کے درمیان محسوس کرنے لگا۔ شاید وہ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی، جبھی اب ہم دونوں زیادہ تر وقت ساتھ گزارنے لگے اور میرا یہ کہنا کہ لڑکیوں سے دور ہی رہا جائے اور صرف کام کی حد تک تعلق رکھا جائے، ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ ہمارے درمیان دوستی اور بے تکلفی پیدا ہونے لگی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ آہستہ آہستہ فاطمہ کس طرح میری زندگی میں داخل ہو کر اس پر اثر انداز ہونے لگی۔ اس کی شخصیت کے ٹھہراؤ اور وقار کا تو میں پہلے ہی معترف تھا، اب اس کی شخصیت کا اسیر بنتا جا رہا تھا۔ ہم غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے اور میں واضح طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ فاطمہ کیلئے میرے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔

فاطمہ نے اپنے آپ کو خاصی حد تک اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ ایسا لباس پہننے لگی تھی جو مکمل طور اس کے جسم کو ڈھانپتا۔ شراب اور خنزیر کے گوشت کا استعمال اس نے فوراً ہی ترک کر دیا تھا اور نماز سیکھ رہی تھی۔ اِس عرصے میں ایک آدھ مرتبہ میں اسے وقار بھائی کے ہاں بھی ملانے لے گیا۔ ویسے تو ان لوگوں نے اس کی خاصی آؤ بھگت کی لیکن اکیلے میں میری ٹانگ کھینچی۔۔۔ ''کیوں میاں، یہ کیا چکر ہے؟ یہ کالی کیوں لیے پھر رہے ہو؟'' وقار بھائی نے پوچھا۔

''کوئی چکر نہیں وقار بھائی! نومسلم ہے، میں چاہتا تھا کہ آپ لوگوں سے بھی مل لے اور بہت سی باتیں بھابی سے اور آپ سے سیکھ لے''۔

''ارے میاں! ان لوگوں کا کیا ہے، آج کچھ ہیں، کل کچھ اور۔ اور دیکھو!'' انہوں نے گویا مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا ''ابھی تک بچے رہے ہو تو بچے ہی رہنا۔ ان کالیوں گوریوں کے چکر میں بڑا بڑا برا ہوتا ہے۔ تمہارے لئے کوئی لڑکیوں کی کمی نہیں؟ ایک سے ایک پاکستانی، بھارتی خاندانوں کی لڑکیاں موجود ہیں''۔

''ایسی کوئی بات نہیں''۔ میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا ''وہ صرف میری دوست ہے''۔

یہ تھا بھی سچ۔ میں نے ابھی اتنی دور تک کا نہیں سوچا تھا لیکن لگتا ہے وقار بھائی نے آنے والا وقت بھانپ لیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ میں اور فاطمہ اتنے قریب آ گئے کہ ایک دوسرے کے بغیر جینا مشکل لگنے لگا۔ تب ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ گو ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے، دفتر کے باہر ملتے ملاتے بھی تھے، اس کے باوجود ایک مخصوص حد ہم نے اپنے درمیان قائم کر رکھی تھی جس پر دونوں ہی بڑی سختی سے کاربند تھے۔ گھر والوں نے تھوڑی سی رد و قدح کے بعد شادی کی اجازت دے دی۔ طے یہی پایا کہ فی الحال سادگی سے نکاح کر لیا جائے تو باقی رسوم و تقریبات ہمارے پاکستان پہنچنے پر ادا کی جائیں گی۔

فاطمہ پر میں نے اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ میں صرف اس وقت یہاں ہوں جب تک ماسٹرز نہیں کر لیتا۔ اس کے بعد جتنی جلدی ممکن ہوگا میں پاکستان چلا جاؤں گا اور باقی تمام عمر اپنے وطن، اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے اتنی دور اجنبی دیس میں گزارنی ہوگی، لہٰذا اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔ میں نے اس پر امریکہ اور پاکستان کے درمیان بنیادی فرق بھی واضح کیے کہ ہمارا ملک ترقی پذیر اور تیسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے جہاں وہ سہولیات اور آسائشیں میسر نہیں جن کی وہ عادی ہے۔ علاوہ ازیں وہاں قدم قدم پر پابندیاں ہوں گی۔ فاطمہ نے یہ تمام باتیں بڑے صبر و سکون سے سنیں اور مسکراتے ہوئے گویا ہوئی کہ وہ اپنے موقف پر قائم ہے اور ان تمام باتوں سے آگاہ ہے اور یہ کہ میرا عمر بھر کا ساتھ اسے ہر شرط پر منظور ہے۔ رہی پابندیوں کی بات تو وہ ان کے لئے بھی تیار ہے۔

میں فاطمہ کے گھر والوں سے بھی مل چکا تھا۔ وہ سب مجھ سے خندہ پیشانی سے ملے۔ شروع میں اس کے والدین اور بھائیوں کو یہ اعتراض تھا کہ اسے میرے ساتھ پاکستان جانے کی

ضرورت کیا ہے بلکہ وہ مجھ سے کہے کہ شادی کرنی ہے تو یہیں رہو لیکن پھر اس کی استقامت دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ وقار بھائی اور شمع بھابی نے شادی کی خبر سخت حیرت اور افسوس کے ملے جلے تاثر کے ساتھ سنی۔ ان کے چہرے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں یہ بات کس قدر ناگوار گزری ہے۔

''آخر پھنس ہی گئے میاں''۔ وقار بھائی بولے''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا مگر بھئی یہ شادی وادی کی کیا سوجھی تمہیں؟ یہ لوگ بھی بھلا کسی کے ہوئے ہیں؟ ان کا ایمان ہے نہ ایقان اور یہ بھی تو سوچو نجانے کتنوں کے ساتھ اس کے تعلقات رہے ہوں گے۔ وہاں سے لوگ بھاگ بھاگ کے یہاں آ رہے ہیں اور ایک تم ہو کہ خود بھی واپس جانا چاہتے ہو اور اسے بھی لے جاؤ گے۔ بھلا اس کا وہاں گزارا کہاں؟ یہ آزاد فضاؤں کی پنچھی، وہاں کی پابندیوں میں اس کا دم گھٹے گا۔ سال بھر بھی رہ لے تو بہت سمجھنا''۔

ان کی باتیں مجھے سخت ناگوار لگ رہی تھیں لیکن میں تحمل سے کام لے رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اتنا بڑا اقدم اُٹھایا ہے تو یہ باتیں ضرور سننا پڑیں گی۔ میں نے صرف اتنا کہا''وقار بھائی! وہ عام امریکی لڑکیوں کی طرح نہیں اور اب تو وہ الحمدللہ مسلمان ہو چکی ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ اس کے اوروں سے کس حد تک تعلقات رہے ہوں گے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ سچے دل سے ایمان لانے کے بعد چاہے پہاڑ برابر بھی گناہ ہوں تو اللہ وہ بھی معاف کر دیتا ہے اور انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے اور اگر آپ یہ بات کر رہے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ سب کچھ ایک حد تک ہمارے معاشرے میں بھی ہوتا ہے لیکن ڈھکے چھپے۔ رہی بات وہاں کی پابندیوں کی تو اس کیلئے وہ پابندیاں یہاں کی آزادیوں سے زیادہ مقدم ہیں''۔

نکاح کی تقریب میں وقار بھائی اور شمع بھابی کے علاوہ میرے چند قریبی دوست شامل تھے۔ بھابی نے فاطمہ کو دُلہن بنا کے تیار کر دیا تھا۔ اُنہوں نے فاطمہ کو ساتھ لے جا کر انڈین سٹور سے ایک خوبصورت ہلکے کام کا شلوار قمیض کا جوڑا دلوا دیا تھا۔ جو دولہا یعنی میری طرف سے تھا۔ کچھ عرصے بعد جب میرا ماسٹرز مکمل ہو گیا تو ہم پاکستان لوٹ آئے۔ میرے گھر والوں اور خاندان والوں نے ہمارا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔ فاطمہ کو نئے سرے سے دُلہن بنایا گیا، ڈھولک بجائی گئی اور

ایک پروقار ولیمے کی تقریب منعقد کی گئی۔ عام طور پہ تو مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن میری پیٹھ پیچھے بڑی باتیں بنیں، خوب ٹھٹھول بازیاں ہوئیں۔ چند ایک بے تکلف دوستوں نے میری ٹانگ کھینچی۔ کسی نے کہا۔

''کیوں بھئی گوری نہیں ملی تھی جو کالی پکڑ لائے؟'' کالی ہی سے کرنی تھی تو اپنے یہاں کی لڑکیوں میں کیا خرابی تھی؟''

میں ہنس کے چپ رہتا۔ پیٹھ پیچھے بھی لوگ اس قسم کی باتیں کرتے تھے، لیکن مجھے پروا تھی نہ فاطمہ کو۔ میں فاطمہ کو ان تمام باتوں کیلئے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ جانتا تھا کہ ہم لوگ کسی کی خوشی میں تو کم ہی شریک ہوتے ہیں، مذاق اُڑانے اور ٹھٹھول بازیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ویسے بھی لوگ رنگ ونسل کے بارے میں بڑے حساس ہیں۔ گورے رنگ پر مرتے اور کالے سے نفرت کرتے ہیں، حالانکہ اگر رنگ ہی دیکھا جائے تو فاطمہ کا رنگ روپ ہمارے ہاں کی لڑکیوں ہی کی طرح تھا اور نقش و نگار میں بھی ٹھیک ٹھاک تھے لیکن بات وہی تھی کہ وہ ایک کالی افریقن لڑکی تھی۔ جسے ہمارے ہاں کوئی برابری کا درجہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

میرے گھر والوں کو اگر تھوڑا بہت قلق تھا بھی تو وہ فاطمہ کی خدمت گزاری، اپنائیت، خلوص اور محبت نے دور کر دیا اور کچھ ہی عرصے میں سب اس کی خوبیوں کے معترف ہو گئے اور اس کے گن گانے لگے۔ مجھے ایک بہت اچھی کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ ہماری شادی کو پانچ سال گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں فاطمہ دو مرتبہ امریکہ بھی چکر لگا آئی تھی۔ اس نے اس خوبی سے اپنے آپ کو ہمارے ماحول میں ڈھال لیا تھا کہ وہ اسی کا حصہ لگتی۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند، مخلتی، غم گساری اور خدمت گزاری میں پیش پیش۔ اس عرصے میں ہم ایک بیٹے اور ایک بیٹی کے ماں باپ بن چکے تھے۔ وہی لوگ جو پہلے ہمارا مذاق اُڑانے میں پیش پیش تھے، جنہوں نے شرطیں باندھیں ہوئی تھیں کہ یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی، اب میری بیوی کی خوبیوں کے دل سے معترف تھے اور کہتے تھے کہ میں امریکہ سے ایک ہیرا لے آیا ہوں۔

ایک روز ایک تقریب میں عاطف سے ملاقات ہوئی جو امریکہ میں میرے ساتھ تھا، اتنے عرصے بعد ایک پرانے ساتھی کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور ہم پرانی باتیں لے کے بیٹھ گئے۔ میں نے سب ساتھیوں، دوستوں کی خیریت دریافت کی اور گفتگو کا سلسلہ وقار بھائی کی طرف مڑ گیا۔ میری

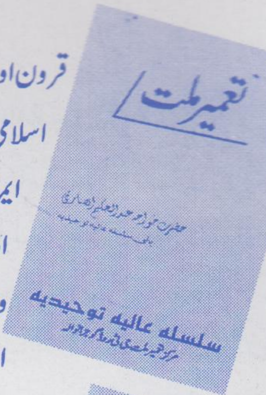
اس بات کے جواب میں کہ وہ لوگ کیسے ہیں، وہ ایک دم خاموش ہو گیا، پھر چند لمحے بعد بولا،'' لگتا ہے تمہیں کچھ نہیں معلوم''۔

''کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''سب خیریت تو ہے نا؟''۔

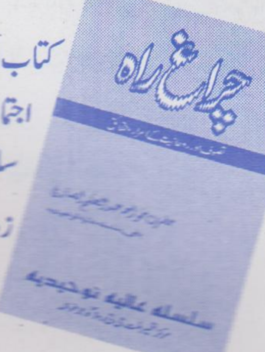
''ہاں ویسے تو خیر، خیریت ہی ہے لیکن بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے بے چاروں کے ساتھ۔ ان کی بیٹی وینا باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے لگی ہے۔ وقار بھائی نے بڑی کوشش کی کہ اسے باز رکھ سکیں لیکن وہ نہ مانی، کہنے لگی '' میں اٹھارہ سال کی عاقلہ و بالغہ ہوں اور آپ مجھ پر جبر نہیں کر سکتے''۔ وقار بھائی نے ایک مرتبہ زبردستی کوشش کی اسے لانے کی تو اس نے پولیس کو رپورٹ کر دی اور بے چارے وقار بھائی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اب وہ بڑے اداس اداس اور افسردہ رہنے لگے ہیں۔ اب وہ اپنے ملنے والوں سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں اور آئے دن کی دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے''۔

میں گم سم بیٹھا تھا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وقار بھائی کے گھر کی بربادی پر مجھے بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ تعجب ہے ان کی دور رس نظر نے میرے اور فاطمہ کے مابین اُبھرتا ہوا تعلق تو دیکھ لیا تھا لیکن وہ اپنے گھر میں اُمڈنے والا طوفان نہ دیکھ سکے۔ آج میں تو فاطمہ کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہوں جو ایک مثالی بیوی، ماں اور بہو ثابت ہوئی ہے اور جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کا کیا بھروسہ ان کا ایمان ہے نہ ایقان اور وہ آزاد فضاؤں کے پنچھی سال بھر بھی گزار لے تو بہت بڑی بات ہو گی۔۔ لیکن خود وہ اپنی زندگی کے کس دوراہے پہ کھڑے ہیں۔۔۔ شاید یہی گردشِ زمانہ ہے!

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف



قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



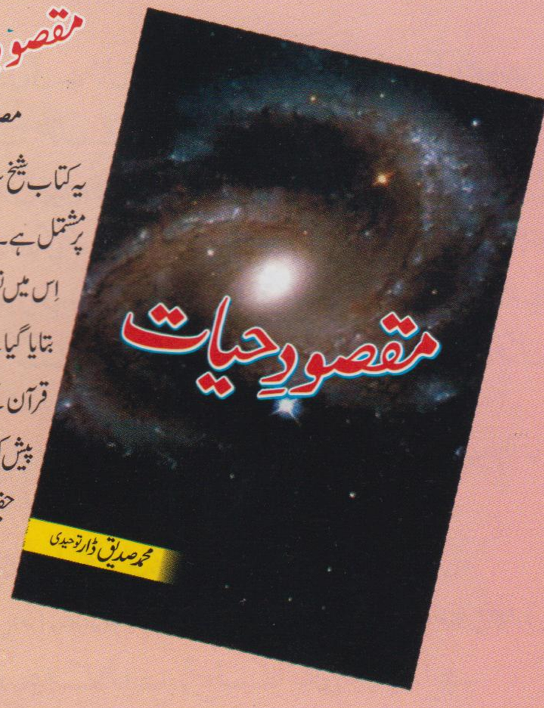
یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کرکے
ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔



وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان
زبان میں بیان کردیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:-
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین
کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا
اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

مکتبہ توحیدیہ کی مطبوعات

مقصودِ حیات

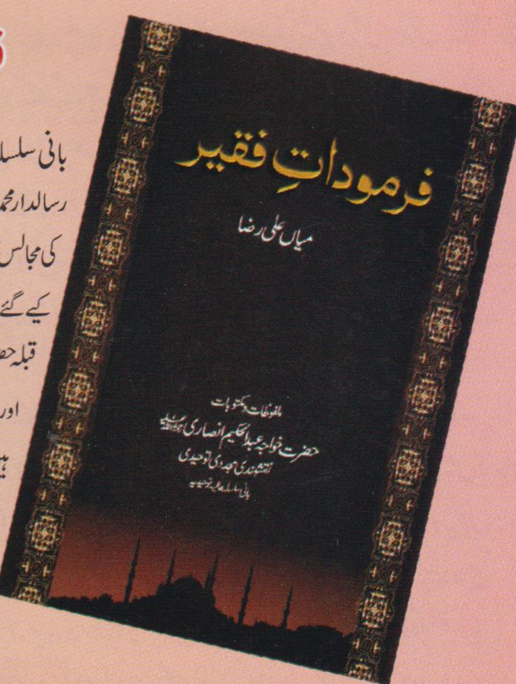


مصنف: محمد صدیق ڈار توحیدی (شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ)

یہ کتاب شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ قبلہ محمد صدیق ڈار صاحب کے سالانہ خطبات پر مشتمل ہے۔ جو اُنہوں نے سلسلہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے۔ اِس میں تصوف کی تعلیمات کو قرآن کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ تصوف اسلام اور قرآن سے باہر کی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ عین قرآن کے احکامات کا نام ہے اور قرآن جس طرح کے بندہ مومن کی تصویر پیش کرتا ہے وہ بلاشبہ ایک سچے صوفی کا ہی روپ ہے۔ قرآن پاک کے حقیقی پیغام کو آسان پیرائے میں سمجھنے کیلئے یہ کتاب سالکانِ راہ حق کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

فرموداتِ فقیر

مرتب: میاں علی رضا



بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ، خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ اور آپکے دوست اور محسن رسالدار محمد حنیف خاںؒ کی سوانح حیات کیساتھ اِس کتاب میں قبلہ انصاری صاحبؒ کی مجالس کا تذکرہ اور اپنے مریدوں کو مختلف اوقات میں لکھے ہوئے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔

قبلہ حضرت کی مجالس میں بیان کیے گئے چھوٹے چھوٹے واقعات نہایت سبق آموز اور راہ سلوک کے مسافروں کے علاوہ عام قارئین کیلئے بھی یکساں دلچسپی کا باعث ہیں۔ آپکے لکھے ہوئے جوابی خطوط میں بھائیوں کیلئے دینی و دنیاوی اور روحانی مشکلات کے حل کا سامان موجود ہے۔ نہ صرف اِن کیلئے جن کو یہ خطوط لکھے گئے بلکہ اب بھی ہر پڑھنے والے کیلئے فائدے کا سبب ہیں۔

Reg: SR - 01
Website: www.toheedia.net